دینی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا علمبردار
• جلد 14 • شمارہ 1 • اگست 2024
Regd.# MC-1366

ماہنامہ فہمِ دین

اللہ سے رشتہ

خوبانی
خوبیاں اور فوائد

آخری ملاقات

ایک عام سا شہری

آزاد وطن کی قدر کریں

BAITUSSALAM PUBLICATIONS
91400056741
Baitussalam.org Baitussalam_org Baitussalam_org +9221-111-298-111
BAITUSSALAM

بیت السلام لیبارٹری اینڈ ڈائیگناسٹک سینٹر

BAITUSSALAM

مستحقین زکوۃ کیلئے مفت ٹیسٹ کی سہولت

خدمت، عزت اور احترام کے ساتھ

اپنی نوعیت کی منفرد اور معیاری لیبارٹری

- او پی ڈی
- ایکسرے
- الٹراساؤنڈ

اور تمام اقسام کے تشخیصی ٹیسٹ دستیاب ہیں

- ہیماٹولوجی
- کیمیکل پیتھالوجی
- مائکروبایولوجی
- مالیکیولر پیتھالوجی/پی سی آر
- امیونولوجی اور سیرولوجی

مناسب قیمتوں میں

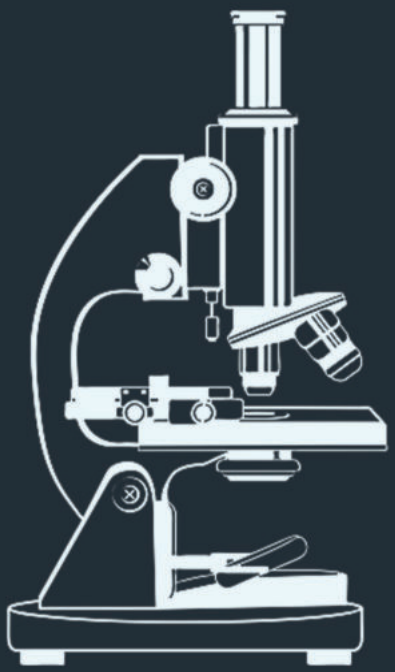

برائے رابطہ

+92 21 35392634

+92 334 2982988

lab@baitussalam.org

شوروم نمبر 01، گراؤنڈ فلور، رائل ٹاورز
مین کورنگی روڈ، نزد قیوم آباد چورنگی
PSO پمپ سے متصل کراچی۔

ماہ نامہ
فہمِ دین
کراچی

اگست 2024

فہم وفکر
مدیر کے قلم سے — 04

اصلاحی سلسلہ
فہمِ قرآن — شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم — 05
فہمِ حدیث — مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ — 06
آئینہ زندگی — حضرت مولانا عبد الستار حفظہ اللہ — 08

مضامین
پاکستان اور تصور اقبال — عذرا خالد — 10
ایک عام ساشہری — اُمِّ محمد سلمان — 11
سوچ کی سلامتی — امۃ اللہ — 12
انمول قمیص کی واپسی — ندا اختر — 12
شاہی لباس — حفصہ محمد فیصل — 14
مسائل پوچھیں اور سیکھیں — مفتی محمد توحید — 15
صحابیات رضی اللہ عنہن — سیدہ فاطمہ طارق — 18
خوبانی — حکیم شمیم احمد — 19

خواتینِ اسلام
گھنی چھاؤں — تنزیلہ احمد — 20
یوم آزادی ایک نئی سوچ!! — ام محمد مصطفیٰ — 22
خوف ناک سبق — لائبہ عبد الستار — 24
سچی کہانی — ناجیہ شعیب — 25
بلاعنوان — انیسہ عائش — 28
ہم کہاں قرآن کی نعمت کہاں — مہوش اسد شیخ — 29
مگر اس میں ہوتی ہے محنت۔۔ — قانتہ رابعہ — 30
دین کیا سکھاتا ہے؟ — عائشہ شیخ — 31

باغچہ اطفال
اللہ سے رشتہ — ام عبد اللہ — 34
نجات کی کشتی — ڈاکٹر الماس روحی — 36
حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ — بنت تاجور — 37
جامن — بنت مسعود — 38
آزادی ایک نعمت — مہوش اشرف — 39

بزمِ ادب
آزادی ایسے منانی ہے اب — ارسلان اللہ خان — 42
اسلام کی بنیاد پہ یہ ملک بنا ہے — محمد زکی کیفی — 42
گلدستہ — شیخ ابو بکر، عبد الرحمن چترالی — 44

اخبار السلام
اخبار السلام — ادارہ — 46

زیرِ سرپرستی
حضرت مولانا عبد الستار حفظہ اللہ

مدیر: محمد خرم شہزاد
نائب مدیر: قاری عبد الرحمٰن
نظرِ ثانی: طارق محمود
تزئین و آرائش: فیضان الحق شمسی

آراء و تجاویز کے لیے
! 0304-0125750

ڈاک سے متعلق امور کے لیے
0323-3229313 | 021-35393912

اشتہارات کے لیے
0314-2981344
marketing@fahmedeen.org

خط و کتابت اور بذریعہ منی آرڈر رسالے کے اجرا کے لیے
26-C گراؤنڈ فلور، سن سیٹ کمرشل اسٹریٹ نمبر 2، خیابانِ جامی،
بالمقابل بیت السلام مسجد، ڈیفنس فیز 4 کراچی

ناشر: فیصل زبیر
مطبع: واسا پرنٹر
مقامِ اشاعت: دفترِ فہمِ دین

آخری ملاقات

مدیر کے قلم سے

ابھی کل کی بات لگتی ہے، 2010 تھا، جولائی کا مہینہ تھا، مجھے اردو میگزین نکالنے کا حکم ملا۔ اس سے پہلے بیت السلام کراچی کا کوئی اردو میگزین نہیں نکلتا تھا، نہ کوئی ٹیم تھی، نہ میگزین کا کوئی نام تھا، نہ کوئی قلم کار اور لکھاری تھا، جو اس میگزین میں لکھنے والا ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ میں بھی اناڑی تھا، اس سے پہلے بس ایک صحافت کورس کیا ہوا تھا اور بڑی مشکل سے آٹھ دس مضمون کہیں مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔

جامعہ بیت السلام نے مجھے ایک لیپ ٹاپ دیا اور وہ بغل میں دبائے میں جامعہ دارالعلوم کراچی کی لائبریری میں جا دُبکا۔ کئی دِن رات وہیں قیام ہوا۔ مختلف قلمی ناموں سے بہت سے تحریریں لکھیں، تاکہ میگزین کا دامن بھرا جاسکے۔ آخر میں اداریہ لکھنے کی باری آئی، میری زندگی کا پہلا اداریہ! جامعہ دارالعلوم کراچی کی لائبریری میں رسائل کا ایک پورا ڈیپارٹ ہے، جہاں ایک صدی کے لگ بھگ سارے رسائل ترتیب سے جلد کر کے رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں گیا، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ نے جو البلاغ کا سب سے پہلا اداریہ لکھا تھا، غالباً 1967 میں، وہ نکال کر پڑھا، ایسے ہی ماہ نامہ الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ماہ نامہ الفرقان میں مولانا منظور نعمانیؒ کے لکھے ہوئے اداریے پڑھے اور اپنا ٹوٹا پھوٹا سے پہلا اداریہ لکھ دیا۔ اس وقت میگزین کے بس 32 صفحات تھے، یہ بھی نہیں پتا تھا کہ بلیک اینڈ وائیٹ چھپے گا یا رنگین صفحے پر۔ کچھ صفحوں کا دامن بھرنا بھی ضروری تھا، کچھ مجھے بھی مختصر لکھنا نہیں آتا تھا، چناں چہ شروع میں ایک عرصہ دو صفحات کا اداریہ لکھا کرتا تھا۔ میگزین کے پورا ہونے تک اس کا نام بھی ماہ نامہ فہمِ دین کراچی طے ہوگیا۔ رنگین چھپنا بھی طے ہوگیا اور پہلا میگزین 2000 کی تعداد میں چھپا۔

پھر ہر ماہ جوں جوں نیا فہمِ دین چھپ کر آتا گیا، ہمارے قارئین کو فہمِ دین کا پتا لگنے لگ گیا، قارئین کے ساتھ ساتھ لکھاریوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی، ڈاکٹر الماس روحی صاحبہ، حکیم شمیم احمد، مفتی محمد توحید ماشاءاللہ یہ لوگ 14 سال سے ابھی تک لکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور قلم دونوں میں برکت عطا فرمائے۔ پھر جوہر عباد، ثانیہ ساجد، عائشہ محبوب، حفصہ فیصل، کائنات غزل، حذیفہ رفیق، محمد ارقم، ندا اختر، قانتہ رابعہ، سید محبوب، بنتِ محمود، بنت گوہر اور اس کے علاوہ بہت سے قلم کاروں کی ایک ٹیم بنتی چلی گئی، حتیٰ کہ فہمِ دین کے صفحات کی تعداد کم پڑنے لگ گئی اور لکھاری اس سے بڑھ گئے۔ ادارے نے صفحات 32 سے 48 کر دیے۔ کچھ میرے اداریے بھی بہتر ہوگئے، لمبا لکھنے کی بجائے مختصر لکھنا بھی کچھ کچھ آگیا، چناں چہ اداریہ بھی سکڑ کر ایک صفحے پر آگیا۔ میگزین ہزاروں کی تعداد میں چھپنے لگ گیا اور یوں فہمِ دین اور ہمارے قارئین کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہوگیا۔ کسی مہینے فہمِ دین وقت پر نہ آپاتا تو پاکستان بھر سے قارئین بے چینی سے رابطہ کرنے لگ جاتے۔

قارئینِ گرامی! آپ نے بھی بیت السلام اور فہمِ دین سے بہت کچھ سیکھا ہوگا، مگر یقین مانیے میں تو آج جو کچھ بھی ہوں، صرف اسی کی وجہ سے ہوں۔ زندگی کے 14 سال مکمل ماہ نامہ فہمِ دین کے ساتھ گزر گئے۔ پیشہ ورانہ زندگی میں 14 سال تقریباً آدھی زندگی شمار ہوتی ہے۔ آج 14 سال بعد سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے کراچی آئے کل 14 اور 6 بیس سال ہو چکے ہیں، والدین بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ چکے ہیں، اُن کی چاہت ہوئی کہ اب میں آپ لوگوں سے اجازت لے کر ملتان چلا آؤں، چناں چہ بوجھل دِل، کپکپاتے ہاتھوں اور موتیوں کی لڑی سے بھیگے دامن کے ساتھ آپ سے آخری ملاقات کرنے چلا آیا ہوں۔

سب سے پہلے میں بیت السلام اور فہمِ دین کا شکر گزار ہوں، جس کی بہ دولت میں آج سب کچھ ہوں، جس نے مجھے لکھنا سکھایا، ترکی اور شام کی سرحد پر بیٹھ کر شامی مہاجرین کی حالتِ زار پر کئی کالم لکھنے کا موقع ملا، اسی فہمِ دین کی بہ دولت سالہا سال اردو ادب پڑھانے کا موقع ملا، اسی کی بہ دولت کئی بڑے ادبی پروگراموں میں اردو تقریر، بیت بازی، نعت خوانی اور اردو انشاپردازی کے مقابلوں میں منصف بننے کا موقع ملا، اسی کی بہ دولت بہت سے مقالہ جات کی سپرویژن کرنے، مختلف کتابوں پر نظر ثانی کرنے اور تقاریظ لکھنے کا موقع بھی ملا۔ بے شمار احسانات ہیں مجھ پر فہمِ دین کے اور میں تہِ دِل سے اس کا شکر گزار ہوں۔ اس اہم موقع پر اپنے قارئین اور لکھاریوں کی ڈھیر ساری محبتوں کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے، لکھاریوں کے فون اور قارئین کے خطوط ہمیشہ مجھے یاد رہیں گے۔

قارئینِ گرامی! آج یہ آخری ملاقات ہے، اپنے بعض اعذار کی وجہ سے میں نے خود ماہ نامہ فہمِ دین سے اجازت لے لی ہے۔ مدیر کا قلم آج سے خاموش ہوگیا، مدیر کی ٹوکری آج سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اب آپ کی کوئی تحریر کم از کم میں ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کر سکوں گا۔ اس سفر میں کہیں کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے امید ہے کہ آپ درگزر فرمائیں گے۔ والسلام!

اخوکم فی اللہ

محمد خرم شہزاد

فہمِ قرآن

المائدۃ 114-120

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (114)

ترجمہ: (چناں چہ) عیسیٰ ابنِ مریم نے درخواست کی کہ ”یا اللہ! ہم پر آسمان سے ایک خوان اتار دیجیے، جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے ایک خوشی کا موقع بن جائے اور آپ کی طرف سے ایک نشانی ہو اور ہمیں یہ نعمت عطا فرما ہی دیجیے اور آپ سب سے بہتر عطا فرمانے والے ہیں۔“ (114)

قَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّىْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (115)

ترجمہ: اللہ نے کہا کہ ”میں بے شک تم پر وہ خوان اتار دوں گا، لیکن اس کے بعد تم میں سے جو شخص بھی کفر کرے گا، اس کو میں ایسی سزا دوں گا جو دنیا جہان کے کسی بھی شخص کو نہیں دوں گا۔“ (115)

تشریح نمبر 1: قرآنِ کریم نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ پھر وہ خوان آسمان سے اترا کہ نہیں، جامع ترمذی کی ایک روایت میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا یہ قول مروی ہے کہ خوان اترا تھا، پھر جن لوگوں نے نافرمانی کی وہ دنیا ہی میں عذاب کا شکار ہوئے (جامع ترمذی) واللہ اعلم۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (116)

ترجمہ: اور (اس وقت کا بھی ذکر سنو) جب اللہ کہے گا کہ ”اے عیسیٰ ابنِ مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو معبود بناؤ؟“ وہ کہیں گے: ”ہم تو آپ کی ذات کو (شرک سے) پاک سمجھتے ہیں۔ میری مجال نہیں تھی کہ میں ایسی بات کہوں، جس کا مجھے کوئی حق نہیں، اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو آپ کو یقیناً معلوم ہو جاتا۔ آپ وہ باتیں جانتے ہیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں اور میں آپ کی پوشیدہ باتوں کو نہیں جانتا۔ یقیناً آپ کو تمام چھپی ہوئی باتوں کا پورا پورا علم ہے۔“ (116)

تشریح نمبر 2: عیسائیوں کے بعض فرقے تو مریم علیہا السلام کو تثلیث کا ایک حصہ قرار دے کر انھیں معبود مانتے تھے اور بعض فرقے اگرچہ انھیں تثلیث کا حصہ تو قرار نہیں دیتے تھے، لیکن جس طرح ان کی تصویر کلیساؤں میں آویزاں کر کے اس کی پرستش کی جاتی تھی، وہ بھی ایک طرح سے ان کو خدائی میں شریک کر دینے کے مرادف تھی، اس لیے یہ سوال کیا گیا۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ (117)

ترجمہ: میں نے ان لوگوں سے اس کے سوا نہیں کہی، جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا اور وہ یہ کہ ”اللہ کی عبادت کرو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور میرا بھی پروردگار۔“ اور جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا، میں ان کے حالات سے واقف رہا، پھر جب آپ نے مجھے اُٹھالیا تو آپ خود ان کے نگران تھے اور آپ ہر چیز کے گواہ ہیں۔ (117)

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (118)

ترجمہ: اگر آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں ہی اور اگر آپ انھیں معاف فرما دیں تو یقیناً آپ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔ (118)

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (119)

ترجمہ: اللہ کہے گا کہ ”یہ وہ دن ہے، جس میں سچے لوگوں کو ان کا سچ فائدہ پہنچائے گا، ان کے لیے وہ باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، جن میں یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش ہے اور یہ اُس سے خوش ہیں، یہی بڑی زبردست کامیابی ہے۔“ (119)

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (120)

ترجمہ: تمام آسمانوں اور زمین اور ان میں جو کچھ ہے، اس سب کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ (120)

فہمِ حدیث

دنیا اور آخرت

یہ دنیا جس میں ہم اپنی یہ زندگی گزار رہے ہیں اور جس کو اپنی آنکھوں، کانوں وغیرہ حواس سے محسوس کرتے ہیں، جس طرح یہ ایک واقعی حقیقت ہے، اسی طرح آخرت بھی جس کی اطلاع اللہ کے سب پیغمبروں نے دی ہے، وہ بھی ایک قطعی اور یقینی حقیقت ہے اور اپنی زندگی کے اس دور میں ہمارا اس کو نہ دیکھنا اور نہ محسوس کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ماں کے پیٹ میں ہونے کے زمانے میں ہم اس دنیا کو نہیں دیکھتے تھے اور نہیں محسوس کر سکتے تھے، پھر جس طرح ہم نے یہاں آکر اس دنیا کو دیکھ لیا اور زمین و آسمان کی وہ ہزاروں لاکھوں چیزیں یہاں ہمارے مشاہدے میں آگئیں، جن کا ہم ماں کے پیٹ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے، اسی طرح مرنے کے بعد عالمِ آخرت میں پہنچ کر جنّت و دوزخ کو اور اس عالم کی اُن چیزوں کو دیکھ لیں گے اور پالیں گے، جن کی اطلاع اللہ کے پیغمبروں اور اللہ کی کتابوں نے دی ہے۔ الغرض! ہماری یہ دنیا جس طرح ایک حقیقی عالم ہے، اسی طرح آخرت بھی مرنے کے بعد سامنے آجانے والا ایک حقیقی اور بالکل واقعی عالم ہے۔ ہمارا اس پر ایمان ہے اور نقل و عقل کی روشنی میں ہم کو اس کے بارے میں الحمدللہ پورا وثوق اور اطمینان ہے۔

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی حقیقت

عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلَ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ (رواه مسلم)

ترجمہ: روایت ہے مستورد بن شداد سے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے، جیسے کہ تم میں سے کوئی اپنی ایک انگلی دریا میں ڈال کر نکال لے اور پھر دیکھے کہ پانی کی کتنی مقدار اس میں لگ کر آئی ہے۔ (صحیح مسلم)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں اتنی ہی بے حقیقت اور بے حیثیت ہے، جتنا کہ دریا کے مقابلہ میں انگلی پر لگا ہوا پانی اور دراصل یہ مثال بھی صرف سمجھانے کے لیے دی گئی ہے، ورنہ فی الحقیقت دنیا کو آخرت کے مقابلے میں یہ نسبت بھی نہیں ہے۔

دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، سب محدود اور متناہی ہے اور آخرت لامحدود اور لامتناہی ہے اور ریاضی کا مسلّم مسئلہ ہے کہ محدود متناہی اور لامحدود لامتناہی کے درمیان کوئی نسبت نہیں ہوتی، جب حقیقت یہ ہے تو وہ شخص بڑا ہی محروم اور بہت ہی گھاٹے میں رہنے والا ہے، جو دنیا کو حاصل کرنے کے لیے خوب جدّ وجُہد کرتا ہے، مگر آخرت کی تیاری کی طرف سے بے فکر اور بے پروا ہے۔

اپنے کو مسافر اور اس دنیا کو سرائے سمجھو

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ أَخَذَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِمَنْكِبَيَّ فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے دونوں مونڈھے پکڑ کے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ "دنیا میں ایسے رہ جیسے کہ تو پردیسی ہے یا راستہ چلتا مسافر۔" (صحیح بخاری)

تشریح: یعنی جس طرح کوئی مسافر پردیس کو اور رہ گزر کو اپنا اصلی وطن نہیں سمجھتا اور وہاں اپنے لیے چوڑے انتظامات نہیں کرتا، اسی طرح مومن کو چاہیے کہ اس دنیا کو اپنا اصلی وطن نہ سمجھے اور یہاں کی ایسی فکر نہ کرے، جیسے کہ یہاں ہی اس کو ہمیشہ رہنا ہے، بلکہ اس کو ایک پردیس اور رہ گزر سمجھے۔

سب سے زیادہ قابلِ رشک بندہ

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ اَغْبَطُ اَوْلِيَائِيْ عِنْدِيْ لَمُؤْمِنٌ خَفِيفُ الْحَاذِ ذُو حَظٍّ مِنَ الصَّلٰوةِ أَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهٖ وَاَطَاعَهٗ فِي السِّرِّ وَكَانَ غَامِضًا فِي النَّاسِ لَا يُشَارُ إِلَيْهِ بِالْأَصَابِعِ وَكَانَ رِزْقُهٗ كَفَافًا فَصَبَرَ عَلٰى ذٰلِكَ ثُمَّ نَقَدَ بِيَدِهٖ فَقَالَ عُجِّلَتْ مَنِيَّتُهٗ قَلَّتْ بَوَاكِيْهِ قَلَّ تُرَاثُهٗ (رواه احمد و الترمذی)

ترجمہ: ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میرے دوستوں میں بہت زیادہ قابلِ رشک میرے نزدیک وہ مومن ہے، جو سبک بار (یعنی دنیا کے ساز و سامان اور مال و عیال کے لحاظ سے بہت ہلکا پھلکا) ہو، نماز اس کا بڑا حصہ ہو اور اپنے رب کی عبادت خوبی کے ساتھ اور صفتِ احسان کے ساتھ کرتا ہو اور اس کی اطاعت و فرماں برداری اس کا شعار ہو اور یہ سب کچھ اخفا کے ساتھ اور خلوت میں کرتا ہو اور وہ چھپا ہوا اور گم نامی کی حالت میں ہو اور اس کی طرف انگلیوں سے اشارے نہ کیے جاتے ہوں اور اُس کی روزی بھی بقدرِ کفاف ہو اور وہ اس پر صابر و قانع ہو۔" پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کی چٹکی بجائی (جیسے کہ کسی چیز کے ہو جانے پر اظہار تعجب یا اظہار حیرت کے لیے بجاتے ہیں) اور فرمایا جلدی آگئی اس کو موت اور اس پر رونے والیاں بھی کم ہیں، اس کا ترکہ بھی بہت تھوڑا ہے۔ (مسند احمد، جامع ترمذی)

Fruiti-O®

NECTARS & FRUIT DRINKS

Real Taste of Nature

آزادوطن کی ناقدری کی سزا

حضرت مولانا عبدالستار حفظہ اللہ

1857 میں برِّ صغیر کے مسلمانوں نے انگریز کے خلاف ایک جدوجُہد شروع کی تھی ، ان کوششوں ، قربانیوں اور جِد وجُہد کا ثمر بالآخر اس صورت میں نکلا کہ 1947 میں یہ آزاد وطن اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا، متحدہ ہندوستان سے انگریز کو نکالنے پر تو سبھی متفق تھے، البتہ اس وقت کے کچھ بزرگ ایسے بھی تھے، جن کا نظریہ تھا کہ ہندوستان تقسیم نہ ہو، مسلمان اجتماعی طاقت کے ساتھ یہاں رہیں۔ یہ نظریہ پورے اخلاص پر مبنی تھا۔ ان بزرگوں کو تقسیم سے زیادہ تقسیم کی شکل پر اطمینان نہیں تھا کہ ایک طرف مشرقی پاکستان اور دوسری طرف مغربی پاکستان اور بیچ کے ہزاروں میل پر ہندو انہ حکومت ! ان حضرات کی یہ رائے تھی کہ یہ ہندو مسلمانوں کو آرام سے رہنے نہیں دیں گے۔

دوسری طرف کچھ بزرگوں کی رائے یہ تھی اور وہ بھی پورے اخلاص پر مبنی تھی کہ مسلمانوں کو آزاد خطہ ملے، جہاں اسلام کے قوانین کا رواج ہو، اسلامی عدالت سے ہر شخص کو انصاف میسر ہو، اسلامی بیت المال قائم ہو، جہاں کوئی غریب کوئی محتاج کوئی ضرورت مند بے سہارا نہ رہے، عدل و انصاف کے قانون کے ساتھ

اکثریت اس کی گرویدہ ہو گئی۔ یعنی پاکستان بننا لا الہ الا اللہ کے نفاذ کے لیے ہے، وہاں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو گا، اسلامی نظام کے مطابق عدالتیں قائم ہوں گی، ہر شخص کو اس کے حقوق اس کی دہلیز پہ ملیں گے، امیر غریب، شہری دیہاتی کسی سے ناانصافی نہیں ہو گی اور یہ تو سبھی جانتے اور مانتے ہیں کہ اگر دنیا میں انسانیت کو حقوق مل سکتے ہیں تو وہ صرف اسلام سے ملتے ہیں۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں کو بھی اسلام سے بہتر کوئی نظام نہیں مل سکتا۔

چناں چہ 1946 میں الیکشن ہوئے کہ ہندوستان تقسیم ہو یا نہ۔ نتیجہ یہی آیا کہ تقسیم ہونی چاہیے، پھر 1947 میں ہندوستان دو قومی نظریے پر تقسیم ہو گیا۔ کلمہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا، لیکن بد قسمتی کہیے یا کیا کہیے کہ اس خطے میں اسلام کا بول بالا نہیں ہو سکا۔ اوّل روز سے سازشیں شروع ہو گئیں، جن کے ہاتھ میں اقتدار آیا انھوں نے اس نظریے اور سوچ کے ساتھ غداری کی جس پر یہ وطن آزاد ہوا تھا اور پھر پہلی سزا یہ ملی کہ اس کا ایک بازو کاٹ دیا گیا اور مشرقی پاکستان بنگلادیش بن گیا۔

اب یہ وہ پاکستان نہیں ہے جو 1947 میں آزاد ہوا تھا اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اُس آزادی کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ ذرائع ابلاغ سے آزادی کے بعد جو رپورٹ آئی پاکستان کی آزادی کے موقع پر 10 لاکھ لوگ قتل ہوئے۔ ہندوستان کے کچھ ذرائع کا دعویٰ تھا کہ چھ لاکھ لوگ قتل ہوئے، 75 ہزار

لوگ اس آزاد خطے میں امن وسکون کے ساتھ رہیں، اگرچہ اس تحریک کو شروع کرنے والوں کی شکل وصورت ، چال ڈھال اور حلیہ مسلمانوں والا نہیں تھا، لیکن ان کے ساتھ کچھ نورانی ہستیاں مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگ تھے۔ وہ اخلاص کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے اس تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ، چناں چہ مشرقی پاکستان کے صدرِ مقام ڈھاکا میں سب سے پہلے جھنڈا جس بزرگ نے لہرایا، وہ مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے تھے اور مغربی پاکستان میں جن بزرگ نے جھنڈا لہرایا وہ مفسّرِ قرآن اور بڑے محدّث حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

آزادی کے ساتھ الگ وطن کے حصول کا نظریہ زیادہ مقبول ہوا، ان کے نعرے عوام میں زیادہ مقبول ہوئے کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ ! ہم لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان

بچے بچے کی زبان پر یہ نعرے ہوا کرتے تھے۔ یہ جذبہ ہر مسلمان کو اس طرح بھانے لگا کہ

عورتوں کو ناموس اور عزّت وآبرو کی قربانی دینا پڑی تھی اور حقیقی تعداد پتا نہیں کتنی ہو گی۔ ہمیں ہر سال یومِ آزادی کے موقع پر یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے جو قربانی دی تھی، کیا وہ اس لیے دی تھی کہ جب آزادی کا دن آئے تو مسلمانوں کے یہاں رقص اور سرود کی محفلیں جمیں، نئے نئے گانے ہوں، ہندوستان کی فلمیں اور اس کے اداکار ان نوجوانوں کے ہیرو ٹھہریں، برائی کی سرپرستی کی جائے، نیکی اور اسلام کا راستہ روکا جائے۔ اگر یہی مقصد تھا تو اس کے لیے نیا ملک بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہ ساری گندگیاں اور خرابیاں تو امریکا ویورپ میں بھی میسر ہیں، خود ہندوستان میں بھی یہ سب کچھ میسر ہے۔ رقص وسرود، سودی لین دین، رشوت لینا اور دینا، شراب نوشی یہ سب کچھ تو ہر جگہ میسر تھا اور ہے، لیکن پاکستان تو اس لیے بالکل نہیں بنایا گیا تھا۔

آیئے ! ایک واقعہ سنتے ہیں، یہاں سندھ میں راجہ داہر کی حکومت تھی۔ اس نے وہ بحری جہاز لوٹ لیا، جس میں پانچ مسلمان بچیاں بھی تھیں۔ اس نے انھیں بھی گرفتار کر لیا، ان بچیوں نے کسی طرح اس وقت کے مسلمان حکم ران عبدالملک بن مروان کو خط لکھا اور وہ خط ان کے

ایک گورنر حجاج بن یوسف تک پہنچا، اس خط میں غیرت بھرے الفاظ تھے کہ تم عرب اور مسلمان ہو، تمہاری غیرت کہاں مر گئی ہے کہ تمہاری بہنیں اور بیٹیاں آج راجہ داہر کی قید میں ہیں۔ خط پڑھ کر وہ بے چین ہو گئے۔ اپنے داماد محمد بن قاسم سے کہا کہ لشکر تیار کرو۔ 17 سالہ یہ پُرجوش نوجوان ایمانی جذبے کے ساتھ لشکر مرتب کرتا ہے کہ راجہ داہر سے انتقام لوں گا اور اپنی بہنوں کو آزاد کراؤں گا۔

جب وہ لشکر تیار کر رہا تھا تو اس کے چہرے پر کچھ پریشانی کے اثرات تھے۔ لوگوں نے پوچھا: آپ پریشان کیوں ہیں؟ کہا: ”پریشان اس لیے ہوں کہ اندازہ نہیں دشمن کا لشکر کتنا بڑا ہے، گلیاں اور راستے بالکل اجنبی ہیں، بس یہ خطرہ ہے کہ کہیں اِن ساتھیوں کو نقصان زیادہ نہ اٹھانا پڑے۔“ پھر کچھ ہی دنوں کے بعد اس سالار کے چہرے پر اطمینان تھا۔ کسی نے پوچھا: ”اب اتنے مطمئن کیوں ہو؟“ کہا: ”پتا چلا ہے کہ وہ بڑا گندا آدمی ہے، غیرت سے خالی ہے، اس نے اپنی بہن سے شادی رچائی ہوئی ہے، ایسا گندا اور بے حیا آدمی کبھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ یہ بات آج دشمن سمجھ گیا اور مسلمان بھول گیا، چناں چہ دشمن نے مسلمان کی بہن اور بیٹی سے حیا اٹھا لی، اس کے گھر سے حیا اٹھالی، وہ مطمئن ہو گیا۔ اب اس کی گود میں پلنے والا بچہ دیوث ہو سکتا ہے غیرت مند نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی شجاع اور بہادر بیٹا نہیں پیدا کر سکتی۔ وطن تو بن گیا، لیکن ہم کیا اس آزادی کا تحفظ کر سکے؟ نہیں! اس لیے کہ ہماری حیا نکل گئی، غیرت مر گئی۔ جسے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ یوں فرمایا کرتے تھے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

یعنی جب قوم کے نوجوان اپنی بیٹیوں، بہنوں، خطے اور اپنے نظریے کے تحفظ کے لیے تلواریں اور تیر اٹھائیں گے، یہ اس قوم کا عروج ہے اور جب اس قوم کے نوجوانوں کے ہاتھوں میں گٹار ہو گا، رقص و سرود کی محفلیں، بے حیائی کا رنگ ہو گا تو یہ قوم کا زوال اور تباہی ہو گی اور افسوس! آج کے تعلیمی اداروں میں یہی سکھایا اور یہی ٹیلنٹ پیدا کیا جا رہا ہے۔ ایک جانب اسرائیل ہے، جس کا ہر نوجوان تعلیمی اداروں میں چاق و چوبند رہتا ہے، جسمانی قوّت حاصل کرتا ہے، تعلیمی اداروں سے مذہبی طاقت حاصل کرتا ہے اور ہمارے تعلیمی اداروں میں نوجوان گانا بجانا اور ناچنا سیکھتا ہے۔ صحت برباد، شکلوں سے نحوست ٹپکتی ہے، چہروں پر رونق نہیں، دلوں میں مایوسی ہے۔ یعنی باطل اور جھوٹا اسرائیل اپنی نسل کو طاقت ور بنا رہا ہے، لیکن سچا مذہب رکھنے والے مسلمان نے اپنے نوجوانوں کو ایسا گندا بنا دیا ہے کہ کالج اور یونی ورسٹی میں بہن بیٹی محفوظ نہیں رہی۔

آزادی کے دن ہمیں یہ تو سوچنا چاہیے کہ ہماری منزل کیا تھی، یہ ملک کس لیے لیا تھا اور کتنا گھاٹا کر بیٹھے، اسلام کے لیے آزادی کا جذبہ کیا ہی خوب صورت جذبہ تھا اور آج یہ قوم اتنی خود غرض ہو گئی ہے کہ جس کو جہاں موقع ملتا ہے، اپنا مفاد دیکھتا ہے، اس ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ہر طرف علیحدگی کے نعرے ہیں اور قومیت، عصبیت کے نعرے ہیں، جب بھی کوئی حقوق کے لیے کھڑا ہوتا ہے، وہ علاقے کا نام لیتا ہے، شہر کا نام لیتا ہے، صوبے کا نام لیتا ہے، زبان کا نام لیتا ہے۔ اسلام کا نام نہیں لیتا جو ہر آدمی کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، اس کا نام نہیں لیتا۔ ہو سکتا ہے ان شہروں، زبان والوں اور قوم والوں کو وقتی طور پر حقوق مل جائیں یا کم از کم یہ نعرے لگانے والوں کو داد مل جائے، لیکن عصبیت تو پیدا کر دی نا! نفرت تو لے کے آ گیا نا! جب کہ اسلام ہر ایک کے حقوق کا تحفظ کرنے والا ہے۔ اگر اسلام کے نفاذ اور اسلام کے مطابق اپنا نظام بنانے کی بات کرتے تو ہر ایک کو اس کے حقوق ملتے، ہر طرف انصاف ہوتا، امن و امان ہوتا۔

وطنِ عزیز کی آزادی اللہ کی طرف سے بڑی نعمت ہے۔ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ اس ملک کی تقسیم پر تو دو رائے ہو سکتی ہیں، ایسے جیسے کہا جائے مسجد یہاں بنے یا کہاں بنے، لیکن جب مسجد بن جائے تو اس کا احترام سب پر فرض ہوتا ہے، اس کی حفاظت سب کی ذمے داری ہوتی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ملک کی تقسیم کے بارے میں تو رائے تھی کہ یوں نقشہ ہونا چاہیے، یوں نہیں ہونا چاہیے، لیکن جب بن گیا تحفظ ایسا ہی ضروری ہے، جیسے مسجد کا تحفظ ہے۔ یہ اللہ نے خطہ دیا تھا، لیکن آج کی نئی نسل کو تو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ اگر تسلسل کے ساتھ آزادی کے دن نئی نسل کو اس آزادی کا پس منظر مقصد بیان کیا جاتا رہتا تو شاید ملک کا یہ نقشہ نہ ہوتا، اگر اس کی آزادی کا جو مقصد تھا، وہ پیغامِ عام ہوتا تو آنے والی نسل کو پتا چلتا کہ آباؤ اجداد نے اس کی آزادی کے لیے کتنا خون دیا ہے، کتنی جانیں دی ہیں، ناموس اور عزّت کی کتنی قربانی ہوئی ہے، اس کے تذکرے نہیں ملتے۔ یہ نعمت تھی، مگر اس کی ناقدری ہوئی، ناشکری ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے سزا دی۔ اللہ نے ایسی ہی ایک سزا کا قرآنِ پاک میں ذکر فرمایا:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ

ایک بستی تھی، جہاں بڑا امن تھا۔ ہر شخص کے دل کے اندر بھی اطمینان تھا، باہر کے دشمن کا ڈر بھی نہیں تھا۔ معاشی حالات بھی بڑے اچھے تھے، لیکن جب اس بستی والوں نے اس امن و سکوں اور خوشحالی کی قدر نہیں کی فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ اللہ نے دو مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔ ایک تو ہر ایک کو خوف کا لباس پہنا دیا، کل کیا ہو گا ایسا عدمِ استحکام، ایسی بدامنی، ایسے حالات، کسی شخص کو اطمینان نہیں۔ ایک تو یہ مصیبت آئی اور دوسری مصیبت یہ آئی کہ معاشی بدحالی ہو ایسا لگتا ہے کہ قرآنِ پاک کی اس آیت میں جیسے ہمارا ہی تذکرہ ہو۔ پاکستان کا ابتدائی دور دیکھیں، اس کی معیشت کتنی مضبوط تھی، اس کی گندم اور اس کے اندر سے نکلنے والے دوسرے خزانے دنیا میں برآمد ہوتے تھے، لیکن جیسے جیسے ہم نے اس مقصد سے دوری اختیار کی اور اس نعمت کی آزادی کی ناقدری کی تو آج حالات دیکھ لیں۔ جب نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے تو یہ دو سزائیں قوموں کو ملا کرتی ہیں۔ امن نہیں رہتا، اطمینان نہیں رہتا اور بھوک اور معاشی بدحوالی ان پر مسلّط ہو جاتی ہے۔

کچھ نعمتیں انفرادی ہوتی ہیں اور کچھ اجتماعی۔ انفرادی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ایمان ہے۔ ساری دنیا کا سونا اور دولت اکٹھی ہو جائے ایمان ان سب سے زیادہ قیمتی دولت ہے۔ اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے اور اللہ ربُّ العزّت ہم سب کو اس کا نور نصیب فرمائے۔ آمین! دوسری نعمت انفرادی تن درستی، تن درستی ہزار نعمت ہے، اللہ حفاظت فرمائے۔ السر ہو جائے تو بہت ساری چیزیں نہیں کھا سکتا، کبھی میٹھا نہیں کھا سکتا، کبھی کچھ اور نہیں کھا سکتا، لیکن تندرستی ہے تو ساری نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لیے کہا گیا تندرستی ہزار نعمت ہے اور اجتماعی نعمت، قومی نعمت یہ ہے کہ قوم کو ایک آزاد خطہ ملے، جہاں وہ امن اور اطمینان کے ساتھ، سکون اور چین کے ساتھ زندگی گزار سکے تو یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ یہ قومی نعمت ہے، لیکن جب ان نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے، ناقدری ہوتی ہے، چاہے وہ انفرادی ہوں، چاہے وہ قومی ہوں تو اللہ کی طرف سے پہلے تنبیہ آتی ہے، پھر عذاب آتا ہے، پھر ناراضی کی شکلیں بھی آتی ہیں کہ خوف کا لباس پہنایا جاتا ہے، بے چینی اور بے سکونی مسلط کر دی جاتی ہے اور اندر کا فقیر اور معاشی بدحالی ان پر مسلط ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں انفرادی اور اجتماعی تمام نعمتوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہر نعمت پر شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ اپنی نافرمانی سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین!

اسلامی جمہوریہ پاکستان اور تصوّرِ اقبال

عذرا خالد

پاکستان دنیا کے نقشے پر وجود میں آنے والا واحد ملک ہے، جو صرف اور صرف دینِ اسلام کے نام سے وجود میں آیا۔ برِّصغیر میں مسلمانوں کے لیے الگ ملک کی جو تحریک چلائی گئی، وہ اسلام کے نام سے شروع کی گئی اور اسلام کے نام پر ہی مسلمانوں کو متحد کیا گیا۔ اس تحریک میں مسلمانوں کے ہر طبقے نے حصہ لیا۔ عوام کو یہی باور کرایا گیا۔۔۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" قیامِ پاکستان سے آج تک اتنے بلند بانگ دعووں کے باوجود آج تک اسلامی ریاست کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر علامہ اقبال نے برِّصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اسلامی ریاست کا تصوّر پیش کیا۔

تصوّرِ پاکستان کو پیش کرنے والے اقبال کے ذہن میں بھی پاکستان کے قیام کا مقصد اسلامی ریاست اور اسلامی تہذیب کی بقا اور اس کے فروغ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

علامہ اقبال نے واضح انداز میں اپنا موقف پیش کیا کہ ہم بحیثیت مسلمان زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو یہ بغیر قرآنِ کریم کے ممکن نہیں ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اردو ادب میں ہمیں اقبال آزادیٔ وطن کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے آزادی کے تصوّر میں اسلام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

جنگِ عظیم اوّل کے بعد مسلمان بکھر گئے تھے۔ خلافتِ عثمانیہ کو سازشوں اور طاقت سے ختم کر دیا گیا تھا۔ برطانیہ اور یورپی اقوام نے مسلمانوں کو غلام بنالیا تھا جو بچی کچی مسلمانوں کی حکومتیں باقی تھیں، وہ بھی برطانیہ اور

ملتِ اسلامیہ ایک ایسے دور سے گزر رہی تھی کہ قوم اپنا اعتماد اور بھروسا بالکل کھو بیٹھی تھی۔ اس موقع پر اقبال نے اپنی تحریروں، خطبات اور شاعری میں قوم کو اعتماد کا درس دیا۔ اس کے ساتھ ہی خودی کا پیغام بھی لوگوں کو دیا کہ خودی نام ہے اس جدوجُہد کا جس میں انسان دوسروں پر بھروسا یا تکیہ کیے بغیر اپنی کوششوں سے کامیابی حاصل کر سکتا ہے، کیوں کہ خودی نام ہے خود پر اعتماد کرنے کا۔ اقبال کا خودی کے بارے میں مشہور شعر ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایک جگہ اس طرح کہتے نظر آتے ہیں:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

مفکّرِ اقبالؒ نے اپنے فلسفیانہ اور فکر انگیز خیالات کو اشعار کا پیراہن دے کر اس سے مسلمانوں کے خیالات کو اور مقاصد کو ایک نیا رُخ دیا۔

پہلا اور مقصدِ اوّل، قیامِ اسلام یعنی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا اور مسلمانوں کو ان کی خوابیدہ قوت کا اندازہ اپنے فکری افکار اور اشعار سے کرایا۔

دوسری بات: غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر برطانوی راج کا خاتمہ کرنا یعنی آزادی حاصل کرنا۔

درحقیقت علامہ اقبالؒ کے انہی مقاصد اور افکار نے مسلمانوں کی تحریکی کوششوں کو تحریکِ پاکستان کا نام دیا۔ علامہ اقبالؒ کے افکار اور خطبات کا مطالعہ کیا جائے تو

یورپی اقوام کے اشاروں پر چلتی اور غلامی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

عالمِ اسلام پر ظلمتِ شب کی ایسی چادر پڑی ہوئی تھی کہ دور تک کہیں بھی روشنی کی اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی تھی۔

ان اندھیروں میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کے علم بردار بن کر سامنے آئے۔ اقبال نے سیاسی بصیرت کے خطبات سے مسلمانوں میں اُجالے کی کرن نمودار کی۔ اپنی شاعری سے ایک نیا جذبہ اور ولولہ بیدار کیا۔

ملت کو نشاۃِ ثانیہ کی کرن دکھائی اور مسلمانِ عالم کو اُمید کی ڈوری سے جوڑے رکھا۔ بقولِ اقبال!

ملت کے ساتھ رابطہ اُستوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

اقبال کے خطبات آج کے دور میں بھی اتنے ہی اہم ہیں، جتنے اس دور میں تھے۔

اقبال فرماتے ہیں! "یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے، صنعت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے۔ اب وقتی تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔" علامہ اقبال کے ان فکری خطبات نے نہ صرف عام آدمی کے ذہن کو جلا بخشی، بلکہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے مسلم لیگ کے اندر جو اختلافات جنم لے رہے تھے، ان کو بھی دور کیا اور سب کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرنے کا سہرا بھی اقبال ہی کو جاتا ہے۔ اقبالؒ کی مثبت اور تعمیری سوچ کی ہی بدولت یہی مسلم لیگ پاکستان کی خالق جماعت کہلانے کی مستحق ٹھہری۔

اقبال کی فراست نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے راضی کیا۔ قائدِ اعظم کی ولولہ انگیز قیادت نے مسلمانوں کو ایک جگہ متحد کیا۔

اس میں بہت سی نمایاں خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ان افکار اور اشعار میں مسلمانوں میں یہ احساس بیدار کیا کہ "ہم مسلمان قوم ہیں، اسلام میں غلامی کا کوئی تصور نہیں۔" اقبال کے یہ خیالات سُن کر مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہونے لگے۔

اقبال نے دو قومی نظریے کو صحیح اور جامع انداز میں منظّم کر کے پیش کیا۔ دو قومی نظریے نے پاکستان کو حقیقی اور ٹھوس نظریاتی بنیاد فراہم کی۔

بقول شاعرِ مشرق:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے

مضمون کے آخری حصے میں قائدِ اعظم کا ایک مشہور خطاب پیشِ خدمت ہے۔

قائدِ اعظم نے 1940 میں پنجاب یونیورسٹی میں یومِ اقبال کے موقع پر ارشاد فرمایا:

"گو کہ میرے پاس سلطنت نہیں ہے، لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کو کہا جائے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا۔" قائدِ اعظم بھی علامہ اقبال کے افکار کو اہمیت دیتے تھے۔

قائدِ اعظم ڈاکٹر علامہ اقبال کو اپنا رہبر، رہنما اور عظیم فلاسفر مانتے تھے۔ اس لیے قائدِ اعظم، علامہ اقبال کو سلطنت سے بھی زیادہ قیمتی مانتے تھے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم نے سلطنت منتخب کر لی اور اقبال کو چھوڑ دیا۔

سوچنا یہ ہے کہ آج کا پاکستان فکرِ اقبال اور تصوّرِ اقبال سے متصادم تو نہیں!!!

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ایک عام سا شہری

ام محمد سلمان

جب میں چھوٹا تھا تو ٹی وی پر چودہ اگست اور یومِ دفاعِ پاکستان کی نشریات بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا۔اس وقت آج کی طرح چینلز کی بھرمار نہیں تھی، صرف پی ٹی وی ہی تھا۔ان دو دنوں میں بہت خوب صورت نشریات آیا کرتی تھیں۔چودہ اگست کو میں صبح ہی صبح ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا، شہدا کی قربانیوں کے بارے میں بتایا جاتا تو میں بہت شوق سے سنتا، فوج کی پریڈ دیکھتا، وطن کی محبت میں ڈوبے ملی نغمے اور پُر جوش تقریریں سنتا اور اندر ہی اندر خوشی سے پھول جاتا۔میں خوش ہوتا تھا کہ ہاں، یہ میرا وطن ہے! یہ صحت مند جفاکش فوج میرے وطن کی ہے! یہ کھیت کھلیان سب میرے ہیں! یہ فیکٹریاں، کارخانے سب میرے ملک کی خودداری کی نشانی ہیں اور یہ خوب صورت دل میں اتر جانے والے قومی گیت میرے وطن کے بارے میں ہیں۔

جب ٹی وی پر چلتا تھا

سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے

تو میں جھوم جھوم جاتا، ساتھ ساتھ گاتا تھا، شاید وطن کی محبت میری جڑوں میں سمائی ہوئی تھی۔ میں جب پاک فضائیہ کے جہازوں کو فضاؤں میں پرواز کرتے دیکھتا تو خود کو بھی ساتھ اُڑتا محسوس کرتا۔

بچپن کا وہ یومِ آزادی بہت خوب صورت ہوا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس زمانے میں جھنڈے، جھنڈیوں اور بیج کے علاوہ اور کوئی چیز جشنِ آزادی کے نام پر نہیں ہوتی تھی، مگر ہمارے دل وطن کی محبت سے بھرپور ہوتے تھے۔

میرا خواب تھا کہ میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور اپنے ملک کے لوگوں کی خدمت کروں گا اور یہی لگن دل میں لیے میں بہت شوق سے اپنی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا، اب میں میڈیکل کالج میں جانا چاہتا تھا، مگر وہ میرے قصبے سے دور، بڑے شہر میں تھا اور میری ماں مجھے کسی صورت اپنے سے دور بھیجنے پر راضی نہ ہوئی۔ ابو جی نے مجھے اپنے علاقے میں ہی ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان کھول دی اور میری زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔ میں خوش تو نہیں، لیکن مطمئن ضرور تھا، کیوں کہ اباماں مجھ سے خوش تھے، پھر ایک سیدھی سادی سی گھریلو لڑکی سے میری شادی ہو گئی اور میں گھر گرہستی کے فرائض ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔

اب تو بالوں میں چاندی اترنے لگی ہے۔ عمرِ رفتہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ میری چھوٹی سی دکان ایک بڑے جنرل اسٹور میں تبدیل ہو چکی ہے، لیکن میں اپنے بچپن کی طرح آج بھی اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہوں۔ یہ واحد چیز ہے، جو بچپن سے لے کر آج تک میرے ساتھ ہے۔

میرے دوست پڑھ لکھ کر بہت آگے نکل گئے۔ کوئی بزنس مین بن گیا، کوئی اچھے سرکاری عہدے پر فائز ہو گیا اور کوئی اچھا کھلاڑی بن گیا۔ انھیں لگتا ہے کہ شاید میں ملکی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکا، مگر ایسی بات نہیں ہے

! میں اپنی کارکردگی سے مطمئن ہوں، کیوں کہ میں نے ہمیشہ اپنے اخلاق و کردار کو سنوارا، تاکہ میرے ملک کو میری صورت میں ایک اچھا شہری ملے۔ میں نے اپنے کاروبار میں کبھی خیانت نہیں کی، ہمیشہ ایمان داری کو اپنا نصب العین بنائے رکھا! کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا، کسی پر ظلم نہیں کیا اور نہ کسی کی حق تلفی کی۔ اپنے وطن کے چپے چپے سے پیار کرتا ہوں، اسی لیے کبھی اپنے شہر، اپنے گلی کوچوں کو گندا نہیں کرتا۔ ہمیشہ چلتے ہوئے راستے سے پتھر، چھلکے اور دیگر کوڑا کرکٹ ہٹاتے ہوئے جاتا ہوں، قریب کوئی کوڑے دان ہو تو اٹھا کے اس میں ڈال دیتا ہوں، ورنہ راستے سے ایک طرف کر دیتا ہوں، تاکہ کسی کو تکلیف نہ ہو، کیوں کہ میں اپنے وطن سے محبت کا عملی ثبوت دیتا ہوں۔

میں نے کبھی ناپ تول میں کمی نہیں کی، کبھی کاروبار میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہونے دی، ہمیشہ محنت اور ایمانداری سے کام کرتا رہا۔ دوسروں سے ہمیشہ نرم اور میٹھے لہجے میں بات کرتا ہوں، تاکہ میرے وطن کے باسیوں کو میرے وجود سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ میں کبھی ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ گیس، بجلی، پانی اور فون صرف بقدرِ ضرورت استعمال کرتا ہوں اور میرے بیوی بچے ان سب کاموں میں میرے معاون ہیں۔ میری بیوی بہت کفایت شعار اور سلیقہ مند ہے۔ فارغ وقت میں محلے کی بچیوں کو قرآن کی تعلیم دیتی ہے۔ ہم لوگ اپنے وقت کو ضایع نہیں کرتے، دن رات اس ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔

کیا ہوا اگر میں کسی اونچے عہدے پر نہیں پہنچا، کوئی قابل ڈاکٹر، بڑا وکیل یا فوج کا پائلٹ نہیں بن سکا۔۔۔ لیکن میں ایک اچھا انسان بنا، ایک اچھا مسلمان بنا، میں نے اپنے وطنِ عزیز کو ایک اچھا شہری اور اچھا خاندان دیا، اپنے بچوں کو ایک مثبت سوچ دی، انھیں معاشرے کا فعال فرد بننا سکھایا۔ میں اپنی زندگی میں کبھی حصولِ پاکستان کے مقصد سے غافل نہیں ہوا۔

کون کہتا ہے کہ ملک کی خدمت صرف بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ کر ہی کی جا سکتی ہے؟ دراصل ہم اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور جب وہ پورے نہیں ہوتے تو ہم سمجھتے ہیں شاید اب ہم کسی کام کے نہیں رہے، ایسا بالکل نہیں ہے، ہر شخص اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے وطن کی خدمت کر سکتا ہے۔ ہر وہ شخص جو اپنے فرائضِ منصبی کو بخوبی ادا کر رہا ہے، ملکی قوانین کی پاسداری کرتا ہے، وطنِ عزیز کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا، وہ دراصل ملک و قوم کی حفاظت، اس کی بقا اور ترقی کے لیے کام کر رہا ہے۔ چاہے وہ کوئی حکومت کا اعلیٰ عہدیدار ہو یا کوئی معمولی ملازم! فوج کا جرنل کرنل ہو یا خانساماں! کسان ہو یا تاجر! جوان ہو یا بوڑھا! گھریلو عورت ہو یا ورکنگ وومن! مزدور ہو یا انجینئر! دھوبی ہو یا موچی! طالب علم ہو یا استاد۔۔۔ ہر وہ شخص جو اپنے آپ سے، اپنے ملک سے اور اپنے دین سے مخلص ہے اور ملک کی سلامتی و بقا اور تعمیر و ترقی کے لیے اپنا مثبت کردار ادا کر رہا ہے تو حقیقتاً وہی شخص ملک و قوم کی خدمت کر رہا ہے، اگرچہ وہ ایک عام سا شہری ہو، اگرچہ وہ ایک عام سا شہری ہو۔۔۔!!

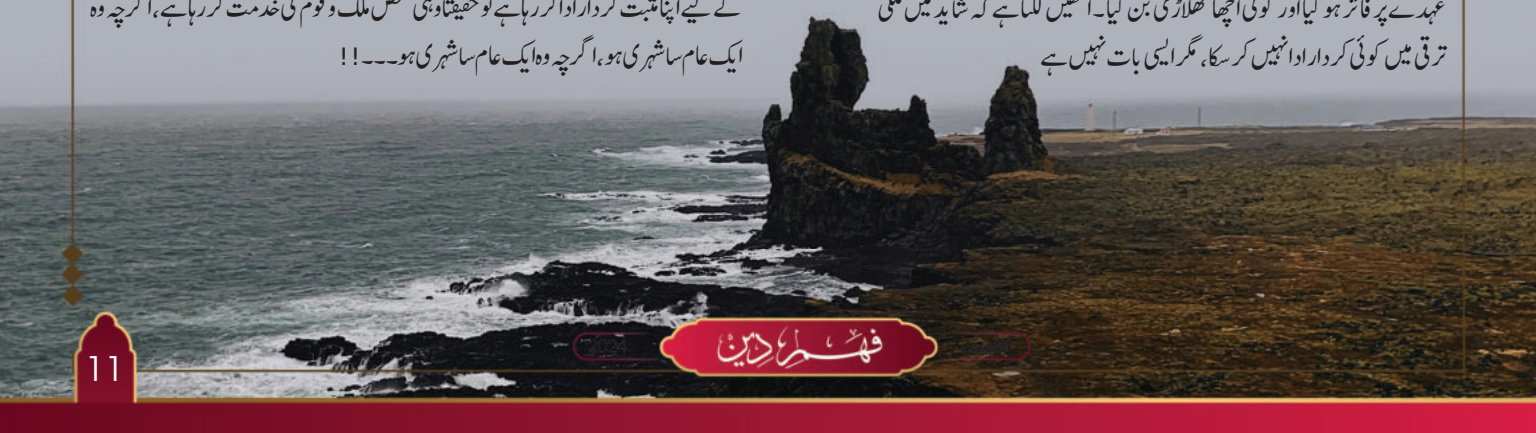

سوچ کی سلامتی

امۃ اللہ

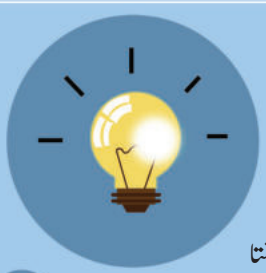

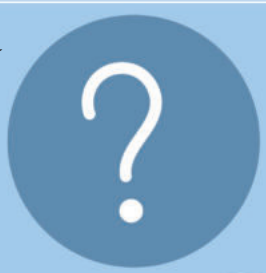

مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ

مومن کی شان ہی الگ ہے، اس کا مقام ہی الگ ہے۔ وہ دیکھتا ہے تو اپنے رب کے نور سے، وہ سنتا ہے تو حق سے، وہ بولتا ہے تو قرآن سے، وہ کرتا ہے تو سنت سے، غرض اس کی ہر ادا نرالی ہے، کیوں کہ مومن وہ نہیں جو خودی میں مست ہے، مومن تو وہ ہے جو سولی میں مست ہے۔ اس کی ادا ادا میں جلوہ گر ہے، شانِ تسلیم و رضا!

آج کا مومن:

نیو ماڈل، نیو جنریشن، نیو پروڈکٹ کانوں سے گزرنے والی باتیں ملاحظہ فرمائیے! وہ کہتا ہے۔ وہی گھسی پٹی باتیں قربانی میں اتنا پیسے لگاتے ہیں، کسی غریب کا راشن ڈلوا دیا کریں۔ معصوم جانوروں کو ذبح کرتے ہیں۔ خیر یہ تو پرانی ہوئیں، آگے سنیں! نماز تو بڑی خشوع سے پڑھتے ہیں، بداخلاقی عروج پر ہے اور جو بااخلاق ہیں، بڑے میٹھے بنے پھرتے ہیں۔ ڈاڑھی کیوں کٹواتے ہیں؟ آگے چلیں: ڈاڑھی تو گز بھر کی ہے (نعوذ باللہ) اور حرکتیں توبہ توبہ۔۔۔ اور سنیں! یہ اچھا ہے بھائی! گناہ کا ٹوکرا بھر کر حج کو چلے جاؤ اور پھر آ کر دعوتیں سمیٹو! اللہ سب کو بلائے اور بھی بہت کچھ ہے۔۔۔ نفلی روزے رکھے جا رہے ہیں، رمضان کے اللہ جانے کتنے چھوڑے ہوں گے! افففف! یہ ہے ہمارا معاشرتی رویہ اور والہانہ انداز میں طنز و تنقید! جب انسان خود کو زبان کے حوالے کرتا ہے تو وہ اس سے وہ وہ کام کروا لیتی ہے، جن کو کرنے سے باقی اعضا لرزتے ہیں!

ذرا سوچیں کہ ہمارا دین اور دین داروں سے رویہ کیسا ہے؟ علما اور صالحین سے ہمارا گمان کیسا ہے یا ہم اس پر تنقید کرتے ہیں، جو عمل ہم خود نہیں کرتے اور ہم ان لوگوں کے بارے میں زبان کو چھوٹ دیتے ہیں، جن کا مقام اللہ کے یہاں خود اللہ نے بتلا دیا کہ جو لوگ ایمان والے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں أُولٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ

دراصل ہم بالکل فارغ لوگ ہیں، جن کے پاس تبصرے کرنے کا اتنا وقت ہے جتنا کہ کسی انسان کو گھر تعمیر کرنے کا۔

جس شخص کو ایمان پر محنت کرنے کی سعادت و توفیق مل گئی، پھر اللہ اس کی ہر ہر شے کو درست فرما دیتے ہیں۔ اخلاق کی، عادات کی، دل کی، سوچ کی سلامتی عطا فرماتے ہیں، پھر وہ اشکال و شبہات میں مبتلا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا سینہ اپنے مالک کے ہر حکم کے آگے کھل جاتا ہے اور وہ اس کی جگہ اور وہ اس کی حکمتوں سے بے پرواہ ہو کر مالک کی رضا جوئی میں مگن ہو جاتا ہے، کیوں کہ حقیقی مومن ہوتے ہیں وہ جو اپنے دل، زبان، کان، آنکھ ہر ہر چیز کی حفاظت کرتے ہیں! اللہ ہمیں اپنے کلموں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور دل و سوچ کی سلامتی عطا فرمائے۔ آمین!

انمول قمیص کی واپسی

ندا اختر

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آپ ﷺ کی قمیص تھی۔ ابو زناد سے مروی ہے کہ سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ کے پاس رسول ﷺ کی قمیص تھی، جو انھوں نے اپنے عظیم بیٹے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ علیہ عنہ کو عطا کر دی تھی، مگر جب انھیں مخالفین نے قتل کر دیا تو اس عظیم سانحہ کے باعث وہ قمیض گم ہو گئی۔

اس حادثہ کے بعد بسا اوقات حضرت اسما رضی اللہ عنہا کہتی تھیں: اَلقَمِيْصُ اَشَدُّ عَلَيَّ مِنْ قَتْلِ عَبدِاللّٰهِ میرے لختِ جگر عبداللہ کا قتل اس قدر تکلیف کا باعث نہیں جتنا کہ نبی کریم ﷺ کی قمیض کے گم ہو جانے سے مجھے تکلیف ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد ملکِ شام کے ایک شخص کے متعلق پتا چلا کہ رسول اکرم ﷺ کی وہ قمیض اس شامی کے پاس ہے، جب قمیض کے متعلق حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے حزن و ملال کا اس شامی کو علم ہوا تو اس نے قمیض لوٹانے کے لیے شرط عائد کر دی کہ سیدہ اسماءؓ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے دربار میں دعائے مغفرت کر دیں، چناں چہ وہ کہنے لگا: لَآ اَرُدُّهٗ اَنْ تَسْتَغْفِرَلِيْ اَسْمَآءُ میں اس قمیض کو اسی صورت میں لوٹاؤں گا، جبکہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مغفرت کریں۔ جب یہ بات سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کو پہنچی تو انھوں نے عرض کیا: كَيْفَ اَسْتَغْفِرُ لِقَاتِلِ عَبْدِاللّٰهِ بھلا اپنے لختِ جگر عبداللہ کے قاتل کے لیے میں کیوں کر دعائے استغفار کر سکتی ہوں؟ لوگوں نے سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ جب تک آپ اس شامی کے حق میں دعائے استغفار کے لیے اللہ کے دربار میں ہاتھ دراز نہیں کریں گی، وہ رسول اکرم ﷺ کی قمیض واپس کرنے سے انکاری ہے، جس کی واپسی کی آپ خواہاں ہیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا: شامی کو میرے پاس آنے کے لیے کہو۔

چناں چہ وہ شامی رسولِ اکرم ﷺ کی قمیض لے کر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت اس کے ہم راہ عبداللہ بن عروہ بھی موجود تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے شامی سے کہا: قمیض عبداللہ بن عروہ کے حوالے کر دو۔ شامی نے قمیض عبداللہ بن عروہ کے حوالے کر دی تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے پوچھا: عبداللہ قمیض حاصل کر لی؟ عبداللہ بن عروہ نے عرض کیا: ہاں۔ تب حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ يَا عَبدَاللّٰهِ عبداللہ! اللہ تمہاری مغفرت فرمائے۔ شامی نے سمجھا کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے عبداللہ کہہ کر اس کے لیے مغفرت کی دعا کی ہے، حالاں کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن عروہ مراد لیا اور کنایہ میں انہی کو دعا دے گئی، مگر شامی نہیں سمجھ سکا۔

Perfect
FRESHENER

CELEBRATING 77TH

PERFECT KA

PAKISTAN

INDEPENDENCE DAY

1947

ProudlyMadeInPakistan

شاہی لباس

حفصہ محمد فیصل

لباس جو انسان کا ستر چھپاتا ہے اور مسلم معاشرے میں تو لباس کی بہت ہی اہمیت ہے۔ مسلمانوں کے آنے سے پیشتر ہندوستان میں قدیم مورتیوں وغیرہ کی تصویروں پر غور کیا جائے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں سلے ہوئے کپڑے پہننے کا رواج نہیں تھا۔

مرد اور عورت دونوں بغیر سلی ہوئی چادروں، ساڑیوں اور دھوتیوں سے بدن ڈھانکتے تھے۔

عرب سیّاح جو فاتحانِ اسلام سے پہلے یہاں پہنچ گئے تھے، انھوں نے سندھ سے لے کر بنگال تک ہر ساحلی شہر اور قریب کے اندرونی علاقوں میں یہاں کے لوگوں کو اسی وضع میں پایا۔

پہلے عرب مسلمان جو یہاں پہنچے وہ اگرچہ کرتے، تہ بند اور عبائیں پہنا کرتے تھے، مگر لباس و وضع میں انھیں یہاں کے لوگوں پر کچھ زیادہ فوقیت حاصل نہ تھی۔ لباس میں ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب ساسانی معاشرت اختیار کر کے بغداد کے عباسی دربار نے شرفائے عرب کے پاجامے، عباو قبا اور خوش قطع عمامے ایجاد کیے۔

یہ لباس زیادہ تر ساسانی دربار کے امرا و اعیان کی وضع سے ماخوذ تھا۔ چند روز میں یہی لباس ان تمام مسلمانوں کا ہو گیا جو مصر سے دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے اور آخر وہ اس لباس کو لیے ہوئے ہندوستان میں آئے۔ تصویروں میں جو لباس عہدِ اوّلین کے مسلمان تاجدارانِ ہند کا نظر آتا ہے، وہ قریب قریب وہی ہے جو عجمی و عباسی امرا و فرماں رواؤں کا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "یہاں کے سلاطین راجاؤں کی تقلید میں جواہرات بہت زیادہ پہنا کرتے تھے۔"

دہلی کے مغل:

دہلی میں دربارِ مغلیہ کا آخری لباس جو ہمیں معلوم ہو سکا یہ ہے کہ "سر پہ پگڑی، بدن پر نیم جامہ، ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا تنگ موڑی دار کا پاجامہ، پاؤں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا اور کمر میں جامے کے اوپر پٹکا۔ بس! یہی دہلی کے قدیم شرفا کی وضع تھی، جس میں محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک کسی قسم کا ردّوبدل نہیں ہوا تھا اور اگر ہوا بھی ہو تو اتنا نہ تھا کہ ہم کو نظر آ سکے۔"

اس لباس میں نیچے سے مراد "کہنیوں تک کا آدھی آستینوں کا شلوکا تھا اور سینے پر سامنے اس میں گھنڈیاں لگائی جاتی تھیں۔" اس کو نیچے پہن کے اس کے اوپر جامہ پہنا جاتا تھا، جو عجمی قبا میں ترمیم کر کے بنایا گیا تھا۔ اس میں گریبان نہ ہوتا تھا، بلکہ دونوں جانب کے کنارے جو "پردہ" کہلاتے تھے، ترچھے ایک دوسرے پر آ کے سینے کو ڈھانک لیتے تھے۔ سینے کا بالائی حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے، اسی طرح کھلا رہتا تھا، جیسے آج کل انگریزی کوٹوں میں کھلا رہتا ہے اور جس طرح فی الحال قمیص سینے کے اوپر والے حصے کو چھپاتی ہے، اسی طرح اُن دونوں نیمہ اس کو ڈھانکے رکھتا تھا۔ سینے پر جامہ کا وہ پردہ جو بائیں طرف سے آتا ہے، نیچے رہتا تھا اور داہنے پہلو پر بندھ دیا جاتا تھا اور اس پر داہنی طرف کا پردہ رہتا تھا جو اوپر بائیں پہلو میں باندھا جاتا تھا، پھر اس میں کمر کے پاس سے دامنوں کے عوض ایک اسکرٹ سی جوڑ دی جاتی تھی، جو ٹخنوں کے اوپر تک لٹکی رہتی تھی۔ اس میں بہت سی چُنٹ دی جاتی تھیں اور اس کا گھیر بہت بڑا ہوتا تھا۔ جامے کی آستینیں آدھی کلائی تک بغیر سلی ہوئی اور کھلی رہتی تھیں اور دونوں جانب لٹکا کرتی تھیں۔ اس کے نیچے سیدھی سادھی تنگ موڑیوں کا پاجامہ ہوتا تھا، جو امرا میں مشروع اور گلبدن کا ہوا کرتا تھا، پھر جامہ کے اوپر پٹکا باندھ لیا جاتا تھا۔

جامہ عموماً باریک ململ کا ہوتا تھا جو ہندوستان کے مختلف شہروں میں نہایت نفیس، باریک اور سبک بنا کرتا تھا اور ساری دنیا میں مشہور تھا۔ ڈھاکہ کی ململ اور جامدانی عالی مرتبہ امیروں اور بادشاہوں کے لیے مخصوص تھی۔

اس کے بعد ایرانی قبا سے ماخوذ کر کے "بالابر" ایجاد ہوا، جس میں گول گریبان بالکل کھلا رہتا تھا، اس لیے کہ سینے کے ڈھانکنے کے لیے نیمہ کافی تھا، جو اس کے نیچے بھی پہنا جاتا تھا۔

چٹلا اور گھیر اس میں سے نکال دیا گیا تھا اور اس ضرورت سے کہ دامن آگے کی طرف نہ کھلیں، داہنے دامن میں ایک چوڑی کلی لگا دی جاتی تھی۔ یہی کلی اس کلی کا نقشہ اوّلین ہے جو فی الحال شیروانیوں میں بائیں جانب نیچے لے جا کے بند سے باندھی یا ٹک سے اٹکائی جاتی ہے۔

اسی بالابر پر ترقی کر کے دہلی میں "انگرکھا" ایجاد کیا گیا، جس میں دراصل جامہ اور بالابر دونوں کو ملا کر ایک نئی قطع پیدا کی گئی۔ اس میں سینے پر چولی قبا سے لی گئی، مگر سینے کو کھلا رکھنے کی جگہ ایک گول اور لمبوترا گریبان بڑھایا گیا، جس کے اوپر گلے کے نیچے ایک ہلال نما "کنٹھا" لگایا جاتا اور وہ بائیں طرف گردن کے پاس گھنڈی نکمے سے اٹکا دیا جاتا تھا۔ چولی نیچے رہتی تھی، جس میں پہلے داہنی طرف کا پردہ نیچے بغل میں بندوں سے باندھا جاتا تھا اور پھر اوپر بند ہوتے تھے، جس سے دونوں طرف کے پردے سینے کے نیچے بیچوں بیچ میں لا کے باندھ دیے جاتے تھے۔ اس میں بائیں جانب تھوڑا سا سینہ کھلا رہتا تھا، چولی نیچی رہتی تھی اور نیچے دامن اگرچہ قبا کے سے ہوتے تھے، مگر پرانے جامے کی یادگار میں دونوں پہلوؤں پر بغلوں کے نیچے چٹلا ضرور رکھی جاتی تھی۔

ابتدائی دور کے مسلمان فرماں رواؤں کے عمامے بڑے بڑے تھے، جن کے نیچے قدیم ترکی وضع کی نوک دار مخروطی ٹوپیاں ہوتی تھی، جو آج کل افغانستان میں مروّج ہیں اور ہندوستانی فوج کی وردیوں میں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

مغلیہ پگڑیاں:

سلطنت مغلیہ کے عہد میں پگڑیاں روز بروز چھوٹی ہونے لگی تھیں۔

دربارِ مغلیہ کے آخری عہد میں امرا اور منصب داروں کی پگڑیاں بہت ہلکی ہو گئی تھیں اور اسی اختصار پسندی نے یہ بات پیدا کی کہ پگڑیاں صدہا قطع کی ہو گئیں اور اکثر بادشاہوں اور امرا

بقیہ صفحہ نمبر 16 پر

سودلپکا کرنے کے لیے ایڈوانس رقم دینے کا حکم

سوال: ایک سوال آپ کی خدمت میں عرض کرنا تھا، جو مچھلیاں لانچ والے جال سے پکڑ کے لاتے ہیں، ان کو پارٹیوں نے پہلے سے کافی نقدی جمع کرائی ہوتی ہے کہ یہ آپ بیس لاکھ روپے اپنے پاس ایڈوانس رکھو اور جتنے کا مال لاؤ گے وہ آپ کو نقد دیں گے۔ وہ پیسے ان کو اس لیے جمع کراتے ہیں، تاکہ وہ مال ان کو ہی دیں، کسی اور کو نہ دیں، کیا ایسا کرنا ٹھیک ہے؟ تنقیح: محترم! آپ وضاحت فرمادیں کہ کیا وہ پارٹی مچھلیوں کا سودا پہلے سے کر لیتی ہے اور یہ رقم ثمن (قیمت) کا حصہ ہوتی ہے یا سودا نہیں ہوتا ہے اور صرف سودے کے وعدے طور پر ایڈوانس دیا جاتا ہے؟ جواب تنقیح: ایک پارٹی نے 10 لاکھ روپے دے دیئے کہ یہ آپ ایڈوانس رکھو، اب وہ مچھلیاں شکار کر کے جتنا مال لائے گا، وہ پیسے ہاتھ کے ہاتھ دے گا، مگر جو پیسے اس نے رکھوائے تھے، وہ بس اس لیے رکھوائے تھے کہ مال آپ مجھے دو گے، کسی اور کو نہیں دو گے۔

جواب: صورتِ مسئولہ میں کسی پارٹی کی جانب سے، اس لیے ایڈوانس رقم کا دیا جانا کہ مچھیرا کسی اور کو مال فروخت نہ کرے، جائز ہے، البتہ وہ رقم لینے والے کے پاس امانت ہو گی اور اس پر امانت کے احکام جاری ہوں گے، لہٰذا لینے والے کے لیے اس کا اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے اور اگر بعد میں سودا نہیں ہوتا ہے تو اس رقم کا واپس کرنا بھی ضروری ہے۔

اگر اقالہ کرتے وقت فوراً سودا واپس نہیں کیا تو کیا اقالہ ہو جائے گا؟

سوال: اگر خریدار بائع (بیچنے والے) سے اقالہ کرنا چاہے اور بائع کے پاس آ کر یہ کہے کہ مجھے یہ سودا بہت مہنگا پڑ گیا ہے، براہِ مہربانی یہ سودا ختم کر کے مجھے پیسے واپس دے دیں، میں آپ کو دو دن بعد سودا واپس کر دوں گا اور بائع اسے پیسے دے دے تو کیا اس صورت میں اقالہ ہو جائے گا؟

جواب: اگر بائع اور خریدار آپس میں باہم رضامندی سے اقالہ کریں اور بائع خریدار کو سودے کی رقم واپس کر دے، جبکہ خریدار بائع کو فوراً سودا واپس نہ کرے، بلکہ دو دن بعد واپس کرے، تب بھی اقالہ درست ہو جائے گا۔

دیون (قرضوں) کی بیع

سوال: ایک شخص کئی لوگوں سے سرمایہ لے کر کاروبار میں لگاتا ہے اور نئے رب المال کو مضاربت میں شامل کرتا ہے، جس کا طریقہ کار یہ ہے کہ اس کو باقی ارباب الاموال کے دیون میں شریک بنایا جاتا ہے، نیز جب یہ رب المال جاتا ہے تو اس کے دیون میں بھی دیگر ارباب الاموال کو شریک بنایا جاتا ہے۔ شرعاً یہ طریقہ کار درست ہے یا نہیں؟

جواب: واضح رہے کہ فقہائے کرام نے دیون کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر نئے رب المال کو دیگر ارباب الاموال کے دیون میں شریک بنایا جائے یا جب کوئی مضاربت ختم کرتا ہے تو اس کا دین خرید کر اس کو پورا سرمایہ دے دیا جائے تو یہ دیون کی بیع ہے اور دیون کی بیع ناجائز ہے، لہٰذا مذکورہ صورت شرعاً درست نہیں ہے۔

بیع میں وکیل کا طرفین سے نفع کمانا کیسا ہے؟

سوال: بیع میں وکیل کا طرفین سے نفع کمانا کیسا ہے؟

جواب: اگر سوال میں وکیل سے مراد کمیشن ایجنٹ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ کمیشن ایجنٹ اور بروکر کی دو حیثیتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ وہ ایسا کمیشن ایجنٹ ہو، جو صرف خریدنے والے یا بیچنے والے کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کا وکیل بنتا ہے اور خود اس کی طرف سے عقد کرتا ہے۔ اس صورت میں وہ صرف اسی سے کمیشن لے سکتا ہے، جس کا وہ وکیل ہو، دوسرے سے نہیں لے سکتا؛ کیوں کہ جب اس نے دوسرے فریق کی ترجمانی نہیں کی تو وہ اس کی طرف سے کمیشن لینے کا حق دار بھی نہیں ہو گا۔

اور اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ کسی کا وکیل نہ بنے، بلکہ دونوں جانب یعنی بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں کی خدمات انجام دے اور دونوں کے درمیان رابطہ کرانے کے عمل کی اُجرت لے۔ اس صورت میں دونوں طرف سے متعینہ کمیشن لینا جائز ہو گا۔

اور اگر وکیل سے مراد کمیشن ایجنٹ نہ ہو تو اگر کوئی شخص دوسرے کو یہ کہتا ہے کہ آپ میرے لیے بازار سے فلاں چیز لے آؤ تو یہ توکیل (وکیل بنانے) کا معاملہ ہے، یعنی پہلے شخص نے دوسرے کو اپنا وکیل بالشّراء بنایا ہے اور وکالت دونوں طرح کی ہوتی ہیں، اُجرت کے بدلے بھی ہوتی ہے اور بطورِ تبرّع بھی ہوتی ہے، پھر بطورِ وکیل کوئی کام کرنے پر وکیل کو اُجرت لینے کا حق اُس وقت ہوتا ہے، جب وکالت کے وقت صراحتاً اُجرت کی شرط لگالی گئی ہو یا پھر یہ دوسرا آدمی (وکیل) معروف اُجرت کے بدلے ہی کام کرنے میں مشہور ہو، یعنی اس کا پیشہ ہی یہ ہو کہ وہ معروف اُجرت کے بدلے کام کر کے دیتا ہو، لیکن اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بھی نہ پائی جائے تو پھر وکیل کو مؤکل سے اُجرت لینے کا کوئی حق نہیں ہے اور اس صورت میں وکیل دوسری طرف سے اُجرت یا منافع کمانے کا کوئی حق نہ رکھے گا۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس صورت میں اُجرت لینے کا حق ہے، اس میں پہلے سے اُجرت متعیّن کر دینی ضروری ہے۔ اُجرت مجہول ہو تو معاملہ فاسد ہو جاتا ہے اور بالفرض پہلے اُجرت مجہول تھی اور کام کر دیا گیا تو وکیل (ایجنٹ) کو اجرتِ مثل دی جائے گی۔

فقط واللہ اعلم

بیع مرابحہ کا حکم

سوال: ایک شخص کاروباری ضرورت کو پورا کرنے یا کاروبار بڑھانے کے لیے دوسرے بندے سے قرض طلب کرتا ہے، لیکن وہ قرض نہیں دیتا، بلکہ اس کے لیے 3 لاکھ کی ٹائل خرید کر اس پر 450000 پر فروخت کر دیتا ہے ایک سال تک قرض کے طور پر، لہٰذا وہ تاجر اس کو مارکیٹ میں لے جا کر کیش/نقد پر فروخت کر دیتا ہے اور اپنی کاروباری ضرورت پوری کر لیتا ہے، اس کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

جواب: صورتِ مسئولہ میں کاروباری شخص کو قرض دینے کے بجائے 3 لاکھ روپے کے ٹائل خرید کر 450000 پر ایک سال تک قرض کے طور پر فروخت کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ یہ بیع مرابحہ ہے، جس میں اصل قیمت میں کچھ اضافے کے ساتھ سامان کو بیچا جاتا ہے۔ یہاں اصل قیمت ۳ لاکھ روپے ہے، جس میں 50% کے منافع کے ساتھ بیع مرابحہ ہو رہی ہے تو یہ جائز ہے، البتہ اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس طرح دوسری بیع ٹائلوں پر قبضہ کرنے کے بعد ہو۔ قبضہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ دوکاندار ٹائل الگ کر کے ان پر خریدار کو قبضہ کرنے کی اجازت دیدے۔

مرض الموت میں ہبہ کا حکم

سوال: ایک شخص جائیداد چھوڑ کے فوت ہو جاتا ہے، اس کی اولاد میں سے ایک بیٹا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ والدِ مرحوم نے وفات سے پہلے مجھے اپنے مکان کے ایک یا دو کمرے انگوٹھا لگا کر میرے نام کر دیے ہیں، اس لیے ان کمروں کا اب میں مالک ہوں۔ مرحوم والد اگرچہ تعلیم یافتہ تھے، لیکن ضعفِ عمری میں بینائی جاتی رہی تھی، اس لیے تحریر یا دستخط کی بجائے صرف انگوٹھا لگاتے تھے۔ شریعتِ مطہرہ میں بیٹے کے اس مطالبے کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب: والدِ مرحوم کا مرض الوفات کے دوران ایک یا دو کمرے اپنے بیٹے کے نام تحریر میں لکھ کر دینا ظاہراً ہبہ ہے اور معنیً وصیت ہے، مذکورہ بالا صورت میں اگر والد مرحوم بیٹے کو کمروں کا مکمل طور پر مالک و قابض بنائے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں تو یہ ہبہ باطل ہو گیا ہے اور اگر مالک و قابض بنا کر کمرے اس کے حوالے کر دیے تھے تو پھر یہ وارث کے لیے وصیت ہے، جو دوسرے ورثا کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں، بہر صورت یہ کمرے بھی والد صاحب کی باقی جائیداد میں شامل ہو کر تمام ورثا میں حصّوں کے مطابق تقسیم ہوں گے۔

لگے ہوئے روزگار کو کسی معقول وجہ کے بغیر تبدیل کرنے کے متعلق حدیث

سوال: لگی ہوئی روزی کو بلاوجہ چھوڑ دینے پر کوئی حدیث ہے تو بتا دیجیے!

جواب: مسند احمد اور سننِ ابنِ ماجہ میں ایک روایت ہے کہ حضرت نافع فرماتے ہیں: میں اپنا سامانِ تجارت شام اور کبھی مصر کی طرف بھیجا کرتا تھا، ایک مرتبہ میں نے عراق کی طرف تجارتی سامان بھجوانے کی تیاری کی، میں اُمُّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور انھیں صورتِ حال بتائی، اماں عائشہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا نہ کرو! تمہیں اور تمہاری جائے تجارت کو کیا ہوا؟ (یعنی کوئی نقصان ہوا؟ کوئی وجہ ہے جو تجارتی رُخ تبدیل کر رہے ہو؟) پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے لیے کسی جگہ رزق کا سبب بنائے تو وہ اسے ترک نہ کرے، یہاں تک کہ اس میں خود تبدیلی نہ آ جائے۔ (مثلاً: نقصان ہو جائے یا اس چیز کی تجارت ختم ہو جائے یا کوئی اور مسئلہ پیش آ جائے) لہٰذا اگر کسی شخص کی روزی یا تجارت کسی مناسب جگہ جاری و ساری ہو تو کسی معتبر و معقول وجہ کے بغیر اسے نہیں چھوڑنا چاہیے، کیوں کہ اسے ترک کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لگی ہوئی روزی کو چھوڑنا اور دنیا زیادہ جمع کرنے کی لالچ پائی جاتی ہے، اس وجہ سے شرعاً پسندیدہ نہیں ہے۔

بقیہ

شاہی لباس

نے اپنے لیے خاص بندشیں اور خاص وضع کی چھوٹی چھوٹی پگڑیاں ایجاد کر لیں۔

حکم رانوں کے سروں پر پرانی دستار نواب سعادت علی خاں کے زمانے تک رہی۔ نواب برہان الملک، نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے سروں پر وہی دستار تھی۔ دہلی کے عہدہ دارانِ سلطنت کی سفید دستار ہوا کرتی تھی، جس پر بڑے درباروں کے موقعوں پر جواہرات کی کلغیاں، مرصّع جیغے اور سرپیچ لگا لیے جاتے تھے، مگر فی نفسہٖ وہ دستاریں سادی اور سفید ہوتی تھیں۔ البتہ نواب سعادت علی خاں کے سر پر ہمیں ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے، جس کو اہل لکھنؤ اپنی زبان میں "شملہ" کہتے تھے۔ یہ شملہ اس طرح بنایا جاتا کہ بھراؤ میں کپڑے کا ایک چوڑا اور پتلا گل دار حلقہ سر کی ناپ کے برابر بنایا جاتا، جو بیچ میں خالی اور کھلا رہتا، پھر کسی نفیس ریشمی یا شالی کپڑے کی پتلی پتلی بہت لمبی بتی بنا کے اس کے بیچوں بیچ اس کپڑے کے حلقے پر نیچے اور اوپر برابر برابر لپیٹ کے ٹانک دی جاتی تھی۔ اس حلقے میں اوپر کی جانب ایک چوڑی پٹی ویسے ہی ریشمی یا شالی کپڑے کی جوڑ دی جاتی تھی، تاکہ وہ اس حلقے کو نیچے اترنے سے روکے رہے، مگر اس سے پوری چندیا ڈھک نہ سکتی تھی۔ یہ تھا لکھنؤ کا اصلی شملہ جس کو پہلے پہل نواب سعادت علی خاں نے پہنا۔

اس کے بعد لباس میں تراش و خراش اور کپڑوں کی نوعیت میں روز بروز ترقی ہوتی رہی جو ہوتے ہوتے اس نوبت پر آ گئی جو آج ہمارے مہذّب ہندوستان کی زیبائش اور زینت کا اوّلین سامان ہے، جس سے ہم سب ملبوس ہیں۔

اکیسویں صدی کا لباس:

آج اکیسویں صدی کا لباس ہلکا پھلکا اور آرام دہ ہے، لیکن اب بھی مخصوص مواقع یعنی شادی بیاہ اور تقریبات کے لیے بھاری، کامدار اور منفرد ملبوسات پسند کیے جاتے ہیں، لیکن عام حالات میں ہلکے پھلکے ملبوسات کی اہمیت ہی مسلم ہو گئی ہے۔

لباس منفرد ہو تو مضایقہ نہیں، لیکن شرم و حیا اور ستر چھپانے کا سبب ہونا چاہیے، ورنہ پھٹی جینز یا کھلی آستینیں، اسی طرح کھلے چاک و گریبان اور پنڈلی سے اونچی شلواریں مرد و زن کو زیب نہیں دیتیں اور نہ ہی شریعت میں اس کی گنجائش ہے۔ بطورِ مسلم ہمیں اپنی ہر روایت اور عادت میں اپنے مذہب کو فوقیت دینی چاہیے، ورنہ مادر پدر آزاد معاشرے میں تو کیا کچھ نہیں ہوتا، اندھی تقلید انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ یہ بات مدِّ نظر رکھ کر ایک خوب صورت اور باحیا معاشرہ اور مستور ملبوسات ہماری پہچان بننے چاہییں، جیسا کہ پچھلی صدی کے ملبوسات آج بھی یاد رکھے گئے ہیں۔

NEW Zaiby Jewellers CLIFTON

A **trusted name** in jewellery since 1974

CELEBRATION OF TIMELESS

beauty & grace

Scan now to visit us:

S-11, Yousuf Grand Square,
Block 8, Clifton, Karachi

Contact us:

NEWZAIBYJEWELLERS

Follow our socials:

021 35835455 - 021 35835488

صحابیات رضی اللہ عنہن

آج کی خواتین کے لیے بہترین نمونہ

سیدہ فاطمہ طارق

اسلام سے پہلے دنیا نے جس قدر ترقی کی تھی، وہ صرف ایک صنف یعنی مرد کی اخلاقی اور دماغی قوتوں کا کرشمہ تھی، لیکن اس میں صنفِ نازک یعنی عورت کی آبیاری کا کچھ دخل نہ تھا۔ اسلام آیا تو اس نے دونوں صنفوں یعنی مرد اور عورت کی جدوجُہد کو وسائلِ ترقی میں شامل کرلیا، اس لیے جب اس کے باغ تمدّن میں بہار آئی تو ایک نیا رنگ و بو پیدا ہوگیا۔

اس بنا پر اسلام میں عورت کو جو مقام حاصل ہوا، وہ دیگر اقوام و مذاہب کے مقابلے میں بالکل مختلف تھا۔ تمام دنیا اپنی قومی تاریخ پر فخر کرتی ہے، لیکن اگر اس سے یہ سوال کیا جائے کہ اس سارے قصے میں صنفِ نازک کا کس قدر حصہ تھا؟ تو ہر طرف خاموشی چھا جائے گی۔ یونان بلا شبہ اپنی "ربات النوع" کو پیش کر سکتا ہے، ہندوستان متعدد عصمت و عفاف دیویوں کے نام لے سکتا ہے۔ یورپ کا "گولڈن ڈیڈس" چند جنگ آزما عورتوں کو منظرِ عام پر لا سکتا ہے، لیکن ان کی وجہ سے دنیا نے کچھ بھی ترقی کی ہے؟ اور تمدّن کا قدم ایک انچ بھی آگے بڑھ سکا ہے؟ تاریخ ان سوالات کا جواب نفی میں دیتی ہے۔

بخلاف اس کے اسلام نے جن پردہ نشینوں کو اپنے کنارہ عاطفت میں جگہ دی۔ انھوں نے دنیا میں بڑے بڑے عظیم الشان کام انجام دیے ہیں، جو تاریخ کے صفحات میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، لیکن چوں کہ ہماری یہ تحریر خصوصًا صحابیات کے حالات کے حوالے سے ہے، اس لیے ہم صرف ان ہی کے کارناموں کو پیش کریں گے، کیوں کہ یہ صنفِ نازک کا پہلا قدم تھا، جو ترقی کی راہ میں اٹھایا گیا ہے۔

مذہبی کارنامے:

مذہبی خدمات کے سلسلے میں سب سے اہم خدمت جہاد ہے اور صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین نے جس استقلال سے اس خدمت کو ادا کیا ہے، اس کی نظیر مشکل سے مل سکے گی۔ غزوۂ اُحد میں جب کفار نے عام حملہ کر دیا تھا تو آپ ﷺ کے ساتھ صرف چند جاں نثار صحابہ رہ گئے تھے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ آپ ﷺ کے پاس پہنچیں اور ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ کفار جب آپ ﷺ کی طرف بڑھتے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔

غزوۂ خندق میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بڑی بہادری سے ایک یہودی کو قتل کیا اور یہودیوں کے حملہ کو روکنے کی تدبیر اختیار کی۔ (زرقانی، ج:2، ص:129)

میدانِ جنگ میں اس کے علاوہ صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین اور خدمات بھی انجام دیتی تھیں، مثلاً پانی پلانا، مقتولوں اور زخمیوں کو اُٹھا کر میدانِ جنگ سے لے جانا، اشیائے خورونوش کا انتظام اور پھر پکانے کا انتظام کرنا، فوج کو ہمت دِلانا، قبر کھودنا، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، تیر اُٹھا کر دینا اور چرخہ کاتنا۔

اشاعتِ اسلام بھی مذہب کی ایک بڑی خدمت ہے اور صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین نے اس سلسلے میں خاص کوششیں کی ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ خطاب کی دعوت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ (اسد الغابہ ج:5، ص:519) اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا کی ترغیب سے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے آستانۂ اسلام پر سر جھکایا تھا۔ (اصابہ، ج:8، ص:106) عکرمہ رضی اللہ عنہ اپنی بیوی اُمّ حکیم رضی اللہ عنہا کے سمجھانے پر مسلمان ہوئے تھے۔ (مؤطا امام مالک، کتاب النکاح)

اسلام کی حفاظت بھی ایک اہم کام ہے اور صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین میں سب سے زیادہ اس خدمت کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ادا کیا ہے۔ 35ھ میں جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور نظامِ مذہب درہم برہم ہو گیا تو انھوں نے اصلاح کی آواز بلند کی، جس پر مکہ اور بصرہ کے لوگوں نے لبیک کہا۔

سیاسی کارنامے:

صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین نے اکثر سیاسی خدمتیں بھی انجام دی ہیں۔ حضرت شفابنتِ عبد اللہ رضی اللہ عنہا اس درجہ صائب الرائے تھیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ رضی اللہ عنہا کی تحسین کرتے اور ان سے مشورہ کرتے تھے۔ (ایضاص 487)

عورت کے سیاسی اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ وہ دشمن کو پناہ دے سکتی ہے۔ سنن ابی داؤد میں لکھا ہے کہ فتح مکہ کے زمانہ میں اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا نے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ تھیں، ایک مشرک کو پناہ دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تم نے پناہ یا امان دی، ہم نے بھی دی۔" (فتح الباری، ج:9، ص:747)

علمی کارنامے:

صحابیات، اسلامی علوم یعنی قرات، تفسیر، حدیث، فقہ، فرائض میں کمال رکھتی تھیں۔ حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، اُمّ سلمہ اور اُمّ ورقہ رضوان اللہ علیہنّ اجمعین نے پورا قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ (اُسد الغابہ، ج:5، ص:586) فقہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ اس قدر ہیں کہ متعدّد جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ (ابنِ سعد، ج:2، ص:126)

اسلامی علوم کے علاوہ اور علوم میں بھی صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین مہارت رکھتی تھیں، مثلاً علمِ اسرار میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو پوری واقفیت تھی۔ (ابنِ سعد، ج:2، ق:1262) خطابت میں اسماء بنتِ سکن رضی اللہ عنہا کو خاصی شہرت حاصل تھی۔ (مسند) تعبیر میں حضرت اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ عنہا مشہور تھیں۔ (اصابہ، ج:8، ص:12)

عملی کارنامے:

صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین میں بعض عورتیں تجارت بھی کرتی تھیں، چناں چہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تجارت نہایت وسیع پیمانے پر تھی۔ (فتوح البلدان بلاذری، ص:477، 478)

لکھنا بہت سی صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین جانتی تھیں۔ شفاء بنتِ عبد اللہ رضی اللہ عنہا کو اس میں خاص طور پر شہرت حاصل ہے۔ مدینہ میں عموماً انصار کی عورتیں کاشتکاری کرتی تھیں۔ مہاجر عورتوں میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہی مشغلہ تھا۔ (مسند، ج:5، ص:166) ان صنعتوں کے علاوہ بعض صحابیات رضوان اللہ علیہنّ اجمعین اور کام بھی جانتی تھیں، مثلاً حضرت سودہ رضی اللہ عنہا طائف کی کھالیں درست کرتیں اور ان کو دباغت دیتی تھیں۔ (اُسد الغابہ، ج:5، ص:440) حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی دستکار تھیں۔ (اُسد الغابہ، ص:465)

یہ بہادر صحابیات کے کارناموں کا دھندلا سا خاکہ ہے مسلمان عورتیں زمانے کے نئے حالات کے ساتھ بدل رہی ہیں، لیکن اگر ہماری خواتین صحابیات کی زندگی کو اپنی زندگی کا نمونہ بنائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ دین داری، خدا ترسی، پاکیزگی، عفّت اور اصلاح و تقویٰ کے ساتھ وہ دنیا داری کو کیسے نباہ سکتی ہیں اور دنیا اور آخرت کی نیکیوں کو اپنے دامن میں کیسے سمیٹ سکتی ہیں۔

خوبانی خوبیاں اور فوائد

حکیم شمیم احمد

تعارف

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے پھلوں کی صورت میں جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں ایک پھل خوبانی بھی ہے۔ یوں تو کئی پھل ہیں جو اپنے ذائقے، تاثیر اور اپنی غذائیت کے لحاظ سے الگ الگ ہیں اور بلاشبہ ہر پھل اپنی خصوصی غذائی اور دوائی تاثیر رکھتا ہے۔ پھلوں میں قدرتی طور پر وٹامنز ہوتے ہیں، جو بیماری کے خلاف جسم میں قوّتِ مدافعت پیدا کرتے ہیں۔ جدید طبّی تحقیق بھی اس بات کی مظہر ہے کہ جسمِ انسانی کی بقا اور بیماریوں سے تحفّظ کے لیے بھی وٹامنز کا ہونا ضروری ہے اور وٹامنز کی کمی جسم کو متعدّد عوارضات کا شکار کر دیتی ہے۔ خوبانی جو مشہور اور مرغوب پھل ہے، یہ پاکستان میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ سوات کی سُرخ اور زرد رسیلی خوبانی کے علاوہ کوہستان کی مفید خوش بودار خوبانی بھی لذّت اور صحت کی فراہمی کا ایک ذریعہ ہے۔ اسے بڑھاپار وکنے کے لیے بہت موثر پھل سمجھا جاتا ہے۔ تازہ خوبانی کے مقابلے میں خشک خوبانی زیادہ مزیدار ہوتی ہے، جسے سال بھر کھا کر صحت اور توانائی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ خوبانی کو فارسی زبان میں خوباں کہتے ہیں، جس کے معنی ”حسین اور خوب صورت“ کے ہیں۔ اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملکِ فارس میں اس پھل کا کیا مقام ہوگا۔

خوبانی کے فوائد

1. خوبانی کا ریشہ ہضم اور جذب میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔
2. خوبانی آنکھ کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔
3. خوبانی کا ریشہ بدہضمی اور قبض کا توڑ ہے۔
4. خوبانی بیماریاں دور کرتی ہے، جس میں نظر کی کم زوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔
5. خوبانی کا اہم جز ویٹا کروٹین ہے، جو جسم میں شامل ہو کر حیاتین الف میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
6. خوبانی کے غذائی ریشے سے آنتوں کی حرکت برقرار رہتی ہے، اس طرح قبض نہیں ہوتا۔ آنتیں ریشے کی وجہ سے اپنا کام اچھی طرح کرتی ہیں۔
7. کھانے سے پہلے خوبانی کھانے سے ہضم کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔
8. تازہ خوبانی کے رس میں شہد شامل کر کے پینے سے مریض تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہے۔ یہ شربت بخار کی شدّت بھی کم کرتا ہے، پیاس کی شدّت کم کرتا ہے اور جسم سے زہریلے مادّے خارج کر دیتا ہے۔
9. قبض کی پرانی شکایت کرنے کے لیے روزانہ چھ سے آٹھ خوبانیاں کھانا بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔
10. خوبانی میں فولاد زیادہ ہوتا ہے۔ خون کی کمی میں مبتلا افراد کے لیے خوبانی بہت مفید ہے، اسے کھانے سے خون کی کمی کی علامات مثلاً سانس پھولنا، چکر، سر درد اور تھکن دور ہو جاتی ہے۔
11. خوبانی کے درخت کے پتے پیٹ کے کیڑوں کو ختم کرنے کی تاثیر رکھتے ہیں، ان کا خیساندہ نہ صرف معدے کی جلن میں فائدہ دیتا ہے، بلکہ یہ مرض بواسیر کو بھی دور کرتا ہے۔
12. خوبانی میں شامل لائیکوپین دل کے لیے مضر کولیسٹرول (ایل ڈی ایل) کی سطح کم کر کے شریانوں کو صاف رکھتا ہے۔

*واضح رہے کہ لائیکوپین ایک اہم مانع سرطان کے طور پر بھی مفید اور موثر تسلیم کیا گیا ہے۔ شریانوں کے صاف رہنے سے دل کو لیسٹرول اور دیگر زہریلے اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ موٹاپا بھی نہیں ہوتا اور ذیابیطس کا خطرہ بھی دور ہو جاتا ہے۔

13. خوبانی قوّتِ مدافعت میں اضافہ کرتی ہے۔ قوّتِ مدافعت کے کم ہونے کی صورت میں سرطان جیسا مرض سر اٹھاتا ہے۔
14. خوبانی میں موجود حیاتین اور غذائی ریشے بھی سرطان کا راستہ روکتے ہیں، خاص طور پر آنتوں میں اس کے ریشے کی وجہ سے سرطان کا سبب بننے والے اجزا جمع نہیں ہوتے۔
15. خوبانی کے استعمال سے بدن میں صفرا کا ترشح بڑھ جاتا ہے، اسی طرح یہ معتدل سودا ہے، ایسے لوگ جن کے جسم میں زیرِ جلد چربی کی گانٹھیں بن جاتی ہیں، جو اگرچہ تکلیف نہیں دیتیں، تاہم نفسیاتی الجھن سی رہتی ہے۔ ایسے لوگ اگر خوبانی کا استعمال مسلسل رکھیں تو زیرِ جلد یہ گانٹھیں تحلیل ہو جاتی ہیں۔
16. وہ لوگ جن کا بلڈ پریشر کم رہتا ہو یا حرکتِ قلب سست ہو، ان لوگوں کو خوبانی کا ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ تاہم خفقانِ قلب یا خون کے بڑھے ہوئے دباؤ (ہائی بلڈ پریشر) میں اس کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

مرض سرطان کا کھوج

زمانہ قدیم سے خوبانی کا شمار حسن افزا پھلوں میں ہو رہا ہے۔ اس میں موجود حیاتین الف کی وجہ سے جلدی شکایت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کا لیپ بھی جلد کو تازگی اور ملائمت بخشتا ہے۔ امریکہ کے محققین نے مرض سرطان کا کھوج لگانے کے لیے پوری دنیا میں سروے کیا، وہ یہ معلوم کر کے حیران رہ گئے کہ گلگت میں اس مرض کا تناسب تقریباً نہ ہونے کے برابر پایا گیا۔ مزید تحقیق سے پتا چلا کہ یہاں کے باشندے خوبانی کی گری بڑے شوق اور کثرت سے کھاتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ مرضِ سرطان سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان کے یہاں خوبانی کی پیداوار بھی دوسرے ممالک سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم! ان تمام خوبیوں کے باوجود خوبانی کے استعمال میں حدِّ اعتدال سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی مقدارِ خوراک پانچ سے دس دانوں تک ہے۔

گھنی چھاؤں

تنزیلہ احمد

گھر میں عجیب سی خاموشی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ سب اپنے اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ پہلے تو شام ڈھلتے ہی اماں بی لڑکیوں کو ہدایات دینی شروع کر دیتیں۔

"اری او مینا! صحن جلدی دھو، روز کہنا پڑتا ہے۔ نینا، کیا موبائل میں گھسی بیٹھی ہو، جا کر وائپر لگاؤ اور چارپائیاں بچھاؤ۔ سارا دن کمرے میں پڑے رہ کر تم لوگوں کا جی نہیں گھبراتا؟ روبینہ، شام کی چائے کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو بھی لانا۔"

اماں بی کی آواز گاہے بگاہے گونجتی رہتی۔ ان کی پکار سن کر بہو اور پوتیاں جیسے تیسے کام نمٹانے میں جُت جاتیں۔ صحن دھل کر ٹھنڈا ہو جاتا۔ قطار میں چارپائیاں بچھا دی جاتیں۔ سامنے اسٹینڈ والا پنکھا رکھ دیا جاتا۔ اماں بی اپنا گاؤ تکیہ اٹھائے شان سے اپنی چارپائی پر یوں براجمان ہوتیں، جیسے گھر کی سلطنت کی ملکہ ہوں۔ جب تک شام کی چائے لوازمات کے ساتھ آتی وہ درود پاک کی تسبیح مکمل کر لیتیں۔ اس دوران جو بھی ملنے آتا، اماں بی کے پاس بیٹھا رہتا اور پھر چاہے سے لطف اندوز ہو کر ہی وہاں سے اٹھتا۔

مینا اور نینا، اماں بی کے اکلوتے بیٹے کی جڑواں بیٹیاں تھیں۔ اماں بی پرانے زمانے اور پرانے خیالات کی تھیں، پھر بھی مجال ہے کہ پوتیوں کی پیدائش اور اس کے بعد پوتا نہ ہونے پر انھوں نے کبھی بہو بیٹے کو سنائی ہوں۔ انھیں رشتے اور اپنی اقدار پیاری تھیں۔

"اولاد تو اللہ کی دین ہے بیٹا ہو یا بیٹی، بس اس کی اچھی تربیت کرنے میں کسر نہیں چھوڑنی چاہیے۔ نسلوں کا معاملہ ہے یہ تو۔" یہ ان کی زبان پر رہتا۔

اماں بی کا زیادہ وقت نماز، تلاوت قرآن اور اذکار میں گزرتا۔ باقی کا وقت وہ سب گھر والوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتی تھیں۔

"اُف! زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا، دادو کے وہی طور طریقے ہیں۔ آج کل کون بیٹھتا ہے یوں صحن میں ڈیرے ڈال کر۔" مینا اکثر منہ بنا کر تبصرہ کرتی۔

"وہی تو! گھر میں اے سی ہے۔ چلو اکٹھے ہی بیٹھنا ہے تو لاؤنج کا اے سی چلا کر سب اکٹھے بیٹھ جائیں، مگر نہیں! دادو نے تو اپنی من مانی ہی کرنی ہے۔ وہ یہ جان بوجھ کر کرتی ہیں، تاکہ ہم سے جھاڑو پونچھا کروا سکیں۔" نینا اپنے نین مٹکاتے ہوئے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی۔ اماں بی اپنی موجودگی میں ان کا موبائل استعمال کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

"کن خرافات میں پڑی رہتی ہو، جاؤ جا کر ماں کا ہاتھ بٹاؤ۔ کام کاج میں مدد کرو۔" یہ سن کر مینا اور نینا کے منہ پھول جاتے۔

"چھوڑیں اماں بی! کام کاج کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ میری مدد کے لیے شوہر ہے نا۔" بہو گھریلو ملازمہ کا حوالہ دیتی، گو کہ اماں بی کو برا تو لگتا، مگر وہ چپ ہو جاتیں۔

اماں بی کے گھر سے جانے پر بہو اور پوتیاں دل ہی دل خوش تھیں۔ ایک صرف ان کا بیٹا تھا، جس کے چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں "نہ جائیں" واضح نظر آتا تھا۔

"بسم اللہ، بسم اللہ! میں صدقے، میری سوہنی خالہ کیسے میرے گھر کا رستہ بھول گئیں۔" اماں بی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ثریا تو پھول سی کھل اُٹھی تھی۔ کئی برسوں بعد اماں بی یوں اچانک اسے ملنے چلی آئیں گی، یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس نے اپنی ماں جیسی خالہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہر برس وہ انھیں کہتی کہ میرے پاس کچھ عرصہ رہیں، مگر اماں بی ٹال جاتیں کہ ان کا کہیں اور دل نہیں لگتا۔ وہ کس دل سے اپنی اکلوتی بھانجی کے پاس گاؤں آئی تھیں، یہ وہ ہی جانتی تھیں۔

بہن تو ان کی جوانی میں ہی چل بسی تھی۔ اس کی بیٹی کو انھوں نے پالا پوسا اور اس کے دودھیال میں ہی چھوٹی عمر میں بیاہ دیا۔ ثریا اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ اس کا ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ دونوں بچے پڑھ رہے تھے۔ یہاں آنے کے دوسرے روز ہی وہ دیکھ چکی تھیں کہ ثریا نے دونوں بچوں پر کتنی محنت کی ہے۔ بچے پڑھائی میں اچھے تھے اور اپنی ساری ذمہ داریاں بھی دونوں نے خود اٹھا رکھی تھیں۔ بیٹا اور بیٹی اپنے کام خود کرتے بلکہ گھر کے کام کاج میں بھی ماں کی مدد کرواتے۔

جب پہلے روز ثریا کی بیٹی حسنہ نے خود ہی صحن میں چھڑکاؤ کر کے گھنی بکائن کے ارد گرد چارپائیاں بچھائیں تو انھیں بے ساختہ مینا اور نینا یاد آئیں۔ انھیں روز کہنا پڑتا تھا، چائے کے ساتھ سبزی کے خوش بودار پکوڑے دیکھ کر انھیں بہو یاد آئی۔

"اماں بی! اب میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔ کم از کم دو تین ماہ آپ میرے پاس رہیں گی۔ آپ پر میرا بھی تو حق ہے۔" ثریا نے لاڈ سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیں، جب کہ ان کا دل سسک رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے گھر سے یوں چلے آنے کی وجہ کیا ہے، ماسوائے ان کی بہو کے۔

کچھ دن تو روبینہ کو گھر کا سکون اور خاموشی خوب بھائی۔ دھیرے دھیرے انھیں وحشت ہونے لگی تھی۔ مینا اور نینا اپنے کمرے میں گھسی رہتیں۔ سب جیسے اکٹھے بیٹھنا بھول رہے تھے۔ بار بار کام کے سلسلے میں انھیں بیٹیوں کو آوازیں لگانا پڑتیں۔ مارے باندھے وہ منہ بنا کر آتیں اور ٹکا سا جواب دے کر چلی جاتیں۔

"صحیح ٹوکتی تھیں اماں بی انھیں، ہر وقت موبائل اور ہڈ حرامی، مجال ہے جو اٹھ کر خود کچھ کریں۔" ایک روز ان کے منہ سے نکلا تو وہ خود ہی چونک گئیں۔ اتنے دنوں سے وہ جس حقیقت سے نظریں چرا رہی ہیں، وہ ان کے عین سامنے سر اٹھائے کھڑی تھی۔

"گھر کے بڑے بزرگ باعثِ برکت اور رحمت ہوتے ہیں۔ ان کے ہونے سے کتنا کچھ اچھا ہوتا ہے، یہ تب ہی سمجھ میں آتا ہے جب وہ موجود نہ ہوں۔" شوہر نے کہا تو روبینہ نے سر جھکا لیا۔ ایک بار بھی انھوں نے اماں بی کو کال کر کے خیر خیریت پوچھنے یا ان سے دل آزاری کے لیے معافی مانگنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

ان کی بیٹیوں کو پتا نہیں کب ٹِک ٹاک کا شوق چڑھا، انھیں تو تب پتا چلا جب دونوں نے اپنی ویڈیو اپ لوڈ کیں۔ صرف انھیں پتا نہیں چلا تھا بلکہ اماں بی بھی جان چکی تھیں۔ اس پر انھوں نے بہت ہنگامہ کیا کہ شریف بچیوں کی یہ حرکتیں نہیں ہوتیں۔

"بس کر دیں دادو! ہماری بھی کوئی اپنی زندگی ہے، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ ہماری دو تین دوستیں ٹِک ٹاک بناتی ہیں، بلکہ ڈانس بھی کرتی ہیں۔ ہم نے تو صرف گانے پر لپ سنگ کی ہے۔" نینا نے ترخ کر جواب دیا۔

"اماں بی آپ جائیں، میں انھیں سمجھاؤں گی۔" روبینہ نے مداخلت کی۔

"یہ تمہاری ہی تربیت اور شہ ہے، جو یہ منہ بھر بھر کے بڑوں کو جواب دینے لگی ہیں۔۔۔" اماں بی غصے سے بولیں۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ میری تربیت کو برا کہہ رہی ہیں۔ ساری زندگی گزر گئی، آپ کی مانتے اور خدمت کرتے ہوئے پر آپ کے دل میں تو زہر بھرا ہے۔" بہو پھٹ پڑی تھی، اماں بی ہکا بکا رہ گئیں۔ شکستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے پوتیوں کی جھنجھلاہٹ بھری آواز سنی تھی: "پتا نہیں کب جان چھوٹے گی ہماری، عذاب۔۔۔!"

یہ جملہ نہیں زہر میں بجھا نشتر تھا جو ان کی روح تک گھائل کر گیا تھا۔

شام میں بیٹے کے آتے ہی انھوں نے ثریا سے ملنے جانے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ حیران پریشان بیٹے کو انھوں نے وجہ نہیں بتائی تھی۔

◆◆◆

ماہِ اگست شروع ہو چکا تھا۔ انھیں بے ساختہ پوتیاں یاد آ گئیں۔ ضد کر کے وہ ہرے سفید امتزاج کے نئے جوڑے سلواتیں، چھوٹی چھوٹی ہم رنگ چیزیں خریدتیں اور باہر گھومنے پھرنے جاتیں، مگر یہاں تو ایسی خاص تیاری دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا! تم لوگ جشنِ آزادی نہیں مناتے۔ کوئی خاص تیاری نہیں کرتے کیا؟" شام میں وہ صحن میں سب کے ساتھ بیٹھیں تو بے ساختہ پوچھ لیا۔

حسنہ اور مراد ہنس دیے۔

"نہیں نانو جان! یہاں شہر والے اللے تللے نہیں چلتے، ہم سادہ لوگ ہیں۔ خوامخواہ کا شور شرابا اور فضول چیزوں پر پیسے کا ضیاع نہ ہمیں پسند ہے، نہ امی نے کبھی اس کی اجازت دی۔"

"اماں بی! بچوں کو بتائیں کہ کیسے ہمارے بزرگوں نے آزادی حاصل کی، قربانیوں کی تو اک لمبی داستان ہے نا۔" ثریا نے دل گیر لہجے میں کہا تو ان کے چہرے پر اک سایہ سا لہرایا۔ ایک ہی پل میں وہ کئی دہائیاں پیچھے چلی گئیں تھیں۔ افراتفری، اضطراب، خون خرابا۔۔۔ عزت و آبرو، جان و مال کا نقصان۔ ہجرت کرنے والا کوئی مسلمان ایسا نہ تھا، جس نے اپنا پیارا نہ کھویا ہو۔ دل خراش داستانیں اور دل دہلا دینے والے واقعات سے تو تاریخ بھری پڑی تھی، جب انھوں نے بچوں کو بتایا کہ آزادی کی خاطر ان کا اکلوتا لاڈلہ بھائی قربان ہو گیا تو آنسو ان کے گالوں پر لڑھک رہے تھے۔

"یہ ملک زمین کا ایک ٹکڑا نہیں، درحقیقت ہمارے جینے کی وجہ ہے۔ یہاں انتشار، بدامنی، ناانصافی، غربت سمیت بہت کچھ برا ہے، مگر اس میں بھی قصور ہمارا ہے۔ ہم نے اس ملک کو کیا سے کیا بنا دیا۔ افسوس!" تأسف سے کہتے ہوئے اماں بی نے آنکھوں سے بہتے کرب کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

"اماں بی! اس علاقے کے سبھی نوجوان مخصوص انداز میں آزادی کا جشن مناتے ہیں۔ علاقے کی صفائی ستھرائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور نئے پودے لگاتے ہیں۔ بچوں میں کتابیں تقسیم کرتے ہیں۔" ثریا نے بتایا تو وہ کھل اٹھیں۔

◆◆◆

شوہر کی بیماری کی وجہ سے شبو تین روز کی رخصت پر تھی۔ حبس اور گرمی الگ، اوپر سے کام کاج کا بوجھ۔ روبینہ کا سر چکرا کر رہ گیا تھا۔ کب سے وہ بیٹیوں کو آوازیں دے رہی تھیں، مگر مجال ہے وہ اپنے اے سی والے کمرے سے نکل کر ان کی بات سنیں۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ ان کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ ویران صحن پر نظر پڑتے ہی وہ دل مسوس کر رہ گئیں۔ عجیب سی ویرانی اور وحشت پورے گھر میں ناچتی پھر رہی تھی۔

"ان دونوں نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے۔ کل ہی باپ بول رہا تھا کہ بجلی اس قدر مہنگی ہو گئی ہے، اے سی کم چلایا کرو، مگر نہیں! یہ تو اپنی مرضی کرتی ہیں۔" روبینہ نے بڑبڑاتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا۔

بیٹیوں کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ دنیا و مافیا سے بے خبر بنی سنوری بیٹھی کوئی نیا ٹِک ٹاک بنا رہی تھیں۔

"خدا کا کوئی خوف ہے یا نہیں، تمہیں منع بھی کیا تھا، باپ کو پتا چل گیا تو تم لوگوں کی خیر نہیں۔" بیٹیوں کو لتاڑتے ہوئے روبینہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہونے والا ان کا شوہر سب سن اور دیکھ چکا ہے۔

◆◆◆

ثریا کے آنگن میں رونق لاؤ لشکر سمیت اتر آئی تھی۔ ان سب کی اچانک آمد عید کے چاند سے کم نہ تھی۔ ثریا کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ پہلی بار ان کا خالہ زاد بھائی، بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ آیا تھا۔

اماں بی حیران اور خوش تھیں۔ ان کا دل جانتا تھا کہ وہ بیٹے، بہو اور پوتیوں کے بنا کتنی اُداس ہیں۔ روبینہ نے آتے ہی جس طرح والہانہ انداز میں اماں بی کو گلے لگایا، اس نے ان کے دل سے سب گلے شکوے دھو دیے تھے۔ نینا اور بینا ان سے معافی مانگ چکی تھیں۔

حسنہ، نینا اور بینا سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ دونوں بہن بھائی نے انھیں نہ صرف اپنا علاقہ دکھایا بلکہ "کلین اینڈ گرین مہم" میں بھی شامل کیا۔

"یہ ہماری زندگی کا سب سے اچھا جشنِ آزادی ہے۔" دونوں نے اعتراف کیا۔

"اور بامقصد بھی۔" حسنہ نے کہا تو سب ہنس پڑے تھے۔

ثریا اور حسنہ سے جلدی شہر آنے کا وعدہ لے کر اماں بی اپنے بچوں کے ساتھ گھر چلی آئیں۔ وہ گھر جو ان کے بغیر سونا اور نامکمل تھا۔

روبینہ سمجھ چکی تھی کہ اماں بی ہی وہ سایہ دار شجر ہیں، جس کی چھاؤں تلے سب بے فکری سے جی سکتے ہیں اور ان کا دستِ شفقت پوتیوں کی اچھی تربیت کے لیے اشد ضروری ہے۔

"آزادی تو یہ ہے کہ اپنوں کے سنگ اطمینان بھری پُرسکون زندگی گزاری جائے۔ رشتوں کے تقدّس، اخلاقیات اور اقدار کو پامال کرنا آزادی ہرگز نہیں۔" یہ حقیقت نینا اور بینا کے والد نے انھیں بہت اچھے سے باور کروا دی تھی۔

صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہوتے سبھی نفوس چہک رہے تھے۔ ان کی وجہ خوشی گھنی چھاؤں تلے ایک ساتھ ہونا تھا۔

یومِ آزادی... ایک نئی سوچ!!

ام محمد مصطفیٰ

"امی، امی! کہاں ہیں آپ؟"

ایمن امی کو آواز دیتی ہوئی بالکونی تک آ گئی، جہاں امی جان کپڑے کھنگال کر ڈال رہی تھیں۔

"کیا ہوا میری چندا کو، کیوں اتنی بے چینی سے امی کو ڈھونڈا جا رہا ہے؟" امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھیے!"

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ایک لسٹ ہے جو میں نے تیار کرلی ہے۔" ایمن آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"کس چیز کی لسٹ تیار کرلی ہماری لاڈورانی نے۔۔۔؟"

"چودہ اگست کی چیزوں کی لسٹ امی جان!" ایمن نے امی جان پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا!"

"چودہ اگست پر کون کون سی چیزیں لینی ہیں ہماری بٹیا کو؟"

"ہرے اور سفید رنگ کا سوٹ، ساتھ ہرے اور سفید رنگ کی چوڑیاں اور جوتے اور ہاں! کلپ بھی ایسا ہی ہم رنگ لینا ہے، نیہا نے تو جیولری سیٹ بھی ایسا ہی لیا ہے تو مجھے بھی لینا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ چھت اور بالکونی سجانے کے لیے بہت ساری جھنڈیاں اور دو بڑے سائز کے جھنڈے۔۔۔ اور امی جی لبنیٰ بتا رہی تھی، وہ لوگ "کٹی بیگ" بھی بناتے ہیں چودہ اگست کو دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے، اس میں گرین ٹافیاں، آزادی رسٹ بینڈ، ہرا غبارہ اور لڑکیوں کے لیے گرین پونی بھی ڈالتے ہیں۔ امی جی کتنا اچھا ہو اگر ہم بھی ایسے "کٹی بیگ" بنوائیں۔" ایمن آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔

امی جان اتنی دیر سے ایمن کی لسٹ اور خیالات سن کر سوچ رہی تھیں کہ آزادی کا مقصد یہ سب چیزیں تو نہیں تھا، یہ ہمارے بچے کس سمت میں چل پڑے ہیں؟

"لیکن ابھی دیر نہیں ہوئی ہے، مجھے اس پر محنت کرنی ہوگی۔" امی نے پُرعزم ہو کر سوچا۔

"امی جان! کیا سوچ رہی ہیں، ہم کب جائیں گے یہ چیزیں لینے؟" ایمن نے بے چینی سے پوچھا۔

چندا! ان چیزوں کی خریداری سے پہلے میں آپ کی سہیلیوں کو ایک پارٹی دینا چاہتی ہوں اور اس پارٹی کا موضوع ہوگا "چودہ اگست کی تیاری"

"واؤ! امی جان آپ نے تو بہت زبردست آئیڈیا سوچا ہے، لیکن اس میں امل جیت جائے گی۔" ایمن افسردگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"دراصل امی جی! امل نے چودہ اگست کی تیاری سب سے زیادہ کی ہے، اس کا ڈریس بھی بہت پیارا اور مہنگا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی چھت سجانے کے لیے بھی خوب تیاری کی ہے۔" ایمن حسرت سے بولی۔

"کوئی بات نہیں گڑیا! آپ پریشان مت ہو، یہ تیاری آپ کی لسٹ کی چیزوں والی نہیں ہے، یہ دوسری قسم کی تیاری ہے اور اس تیاری کا پتہ پارٹی والے دن چلے گا۔"

"اب آپ اپنی تمام سہیلیوں کو اس اتوار کو ہمارے ڈرائنگ روم میں شام کی چائے پر آنے کی دعوت دے دیجیے۔" امی جی مسکرا کر بولیں۔

"ٹھیک ہے امی جان!"

ایمن کی تمام سہیلیاں ڈرائنگ روم میں جمع تھیں۔ امی جان کو آتے دیکھا تو سب نے سلام کیا۔

"جی سب تیار ہیں؟"

"جی آنٹی۔۔۔!" امی جان نے لیپ ٹاپ آن کیا، وہاں مختلف معذور بچے نظر آئے جو بولنے، سننے، دیکھنے اور بعض چلنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔

ایمن کی سہیلیاں ان بچوں کی ویڈیو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

اگلی ویڈیو چلائی گئی، اس میں بالکل تندرست بچے تھے، لیکن پھٹے، پرانے کپڑے پہنے کوئی کچرا چن رہا ہے تو کوئی چائے کے ڈھابے پر میز صاف کر رہا ہے تو کوئی برتن دھو رہا ہے۔

اب ایک اور ویڈیو چلی، جس میں صاف ستھرے نکھرے نکھرے بچے ہاتھوں میں کتابیں اور سپارے تھامے مدرسے اور اسکول کی جانب رواں دواں ہیں۔

"جی بچیو! کیسی لگیں یہ ویڈیوز؟"

"بہت اچھی آنٹی!"

"مگر ان سب کا مقصد؟" ثانیہ نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے سوال کیا۔

"شاباش بیٹا! میں یہی سب بتانا چاہ رہی تھی اور اسی لیے اس پارٹی کا اہتمام کیا ہے کہ بحیثیت پاکستانی ہمارا یومِ آزادی منانے کا مقصد کیا ہے؟ ہمیں ان معذور بچوں کا سہارا بننا ہے، ان غریب بچوں کی امداد کرنی ہے، تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔"

"اور یہ سب ہم کیسے کر سکتے ہیں؟" امل کا سوال آیا۔

"اگر ہم یومِ آزادی کی تیاری کپڑوں، جوتوں اور کٹی بیگ کے بجائے ان بچوں کے ساتھ منائیں، ان پیسوں سے ان کے لیے کتابیں، کپڑے اور جوتوں کے تحائف بنائیں تو کتنا نیکی کا کام ہو جائے؟ یہ ہرا سوٹ، سفید اسکارف اور دیگر چیزیں ہم ایک دن کے استعمال کے بعد رکھ دیتے ہیں اور اکثر چیزیں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی کرتے ہیں اور دوبارہ استعمال بھی نہیں کرتے۔ ان بچوں کو جو ہم کپڑے، جوتے وغیرہ دیں گے، اس سے ہمیں سچی خوشی ملے گی۔ یہ چیزیں وہ پورا سال استعمال کر کے آپ کو دعائیں دیں گے اور کچھ پیسوں سے معذور بچوں کی امداد کریں، ان کی ضرورت کا سامان ان کو مہیا کر کے اپنے لیے صدقہ جاریہ بنائیں گے، اس طرح ہم نہ صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیں، بلکہ اپنے وطن اور اس کے لوگوں کی خدمت کرنے والوں میں شمار ہوں گے۔" امی جان کی باتیں سن کر ایمن کی ساری سہیلیاں سوچ میں پڑ گئیں اور پھر سب سے پہلے امل نے کہا۔

"آنٹی! آپ نے ہمیں بہت پیاری پیاری باتیں بتائیں، ہم واقعی فضول چیزوں میں پیسے ضائع کر کے اصل مقصد کو بھول گئے تھے۔ جزاک اللہ خیرا! آنٹی!" امل کے بعد تمام سہیلیوں نے ایک ایک کر کے وعدہ کیا کہ وہ اس یومِ آزادی کو ان باتوں پر عمل کر کے اور اسی طرح منا کر ایک منفرد یومِ آزادی منانے کا آغاز کریں گی اور سچی خوشی حاصل کریں گی۔ ان شاء اللہ!!!

عالمی ادارہ بیت السلام ویلفیئر ٹرسٹ

سستی روٹی پراجیکٹ

لاکھوں روٹیاں مستحقین تک

5 روپیہ صرف عزت نفس کی خاطر

سپر فائن آٹا براہ راست بیت السلام ویئر ہاؤس بھی پہنچا سکتے ہیں کم سے کم 50 کلو

خوف ناک سبق

لائبہ عبدالستار

"آج آفس میں کام زیادہ تھا، میں نے گھر پر فون کیا کہ تاخیر سے پہنچوں گا۔"

بالآخر میں رات 11 بجے کام مکمل کر چکا تھا۔ دسمبر کی سرد رات تھی، میں اپنا سامان اٹھا کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

میں نے ٹوپے سے لے کر گرم جیکٹ، موٹی اونی شال، دستانے، موزے سب پہن رکھے تھے۔

تقریباً بیس منٹ کی مسافت پر میرا گھر تھا۔ ابھی نکلا ہی تھا کہ راستے میں سفید لباس میں ملبوس سفید چادر لپیٹے بابا جی نظر آئے جو کہ گاڑی کے منتظر تھے، میں نے حسبِ معمول فوراً اپنی گاڑی روکی۔

"بابا جی! کس جگہ جانا ہے آپ کو؟" میں نے ہلکا سا شیشہ کھول کر پوچھا۔

"بیٹا! جہاں تم جاؤ گے، وہیں میں جاؤں گا۔" بابا جی سنجیدگی سے بولے۔

"جی، مطلب؟" میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

"ارے برخوردار! گاڑی کا دروازہ تو کھولو بہت ٹھنڈ لگی ہے۔"

"جج جی، آیئے آپ پیچھے بیٹھیے!" میں نے جلدی سے دروازے کا لاک کھولا۔

"سیدھا چلیں بابا جی؟"

"ہاں ہاں، چلو!" میرے پوچھنے پر بابا جی نے جواب دیا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

لوگوں کو لفٹ دینا میری روز مرّہ عادت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، جب بھی کسی شخص کو سواری کے انتظار میں دیکھتا تو اسے منزلِ مقصود پر پہنچانا میری ذمہ داری ہوتی، یہ جانے بغیر کہ اس نے کہاں جانا ہے، وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، مجھے اس سب سے کوئی غرض نہ ہوتی۔

میری اسی عادت پر گھر والوں سے بحث رہتی، یہی نصیحت سننے کو ملتی کہ کسی انجان درندے کے ہتھے نہ چڑھ جانا، کہیں نیکی گلے ہی نہ پڑ جائے۔

مگر کیا نیکی بھی گلے پڑتی ہے؟

نیکی کا بدلہ تو ہمیشہ اچھا ہی ملتا ہے۔

میری عقل کا دائرہ بس یہیں تک محدود تھا۔

اب تک میں بابا جی کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا، انھوں نے سردی کی وجہ سے چادر منہ پر ڈالی ہوئی تھی، بس ان کی ایک آنکھ ظاہر تھی جو میں بخوبی غور کرنے پر دیکھ پایا، باقی پورا چہرہ چادر میں چھپا تھا۔

ان کی لڑکھڑاتی آواز کم زور اور جھکے ہوئے وجود سے میں بس اتنا ہی جان پایا کہ یہ کوئی ضعیف شخص ہے۔

روڈ پر سنّاٹا چھایا تھا۔ لوگ اپنے ٹھکانوں میں گرم لحافوں میں نیم دراز تھے۔

میں بابا جی کو سامنے لگے شیشے سے وقتاً فوقتاً دیکھ رہا تھا، اچانک میں چونک گیا، یہ یہ کک کیا!!!! میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، سانسیں خشک ہو گئیں۔

"ارے یہ کیسے ہو گیا؟" بابا جی کی سفید چادر کی جگہ کسی کالی بالوں والی خوف ناک چادر نے لے لی تھی، جسم میں سنسنی سی لہر دوڑ گئی۔

ابھی میں خود کو اس خوف سے نکالنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر برابر والی فرنٹ سیٹ پر پڑی۔

"آآآ!!۔۔۔" میں نے چیخ کو روکنے کے لیے ایک ہاتھ منہ پر رکھا۔

"یہ کیا!! سفید چادر آگے کس نے رکھ دی۔" میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

"بب بابا جی! کون سا علاقہ ہے آپکا؟" میں نے ڈر پر قابو پاتے ہوئے بابا جی سے سوال کیا، مگر بابا جی پر سکوت طاری تھا۔

اسی دم میری گاڑی کی اندرونی روشنی بند ہو گئی، اب میں بابا جی کو شیشے میں سے نہیں دیکھ سکتا تھا اور پیچھے مڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

دو منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک لائٹ جل گئی، شکر کچھ سہارا ملا، میں نے پھر سفید چادر کی طرف دیکھا۔

میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اپنی کیفیت ٹھیک کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ایک بار پھر لائٹ بند ہوئی، کچھ ہی دیر میں پھر جل گئی، پھر میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے بچی۔

"ارے ے ے باپ رے ے خخ خوون خون!" میرے لب آہستگی سے بڑبڑائے۔

اب سفید چادر پر جگہ جگہ خون لگا تھا۔

"بب بابا ججی بابا جی!" میں نے بمشکل ایک بار پھر بابا کو مخاطب کیا۔

"بابا!!!!جی!"

"کیا مسئلہ ہے؟ کیوں چلا رہے ہو؟ دیکھ نہیں رہے مجھے نیند کے جھونکے آ رہے ہیں۔"

"بابا جی! اتر نا کک کہاں ہے آپ کو؟"

"قبرستان۔۔۔!" پھر سنجیدگی سے جواب دیا گیا۔ میں نے ڈرے سہمے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا۔

"خون پیتے ہو؟" اچانک بابا جی نے متوجہ ہو کر سوال کیا۔ میں مسلسل کچھ نہ کچھ پڑھ رہا تھا۔

"سنا نہیں؟" بابا جی بلند آواز سے گرجے۔

"میں پوچھ رہا ہوں خون پیتے ہو؟"

"نن نہیں، نن نہیں۔" میں نے کانپتی آواز سے جواب دیا۔

"کیوں؟" بابا جی نے اگلا سوال داغا۔

"کیوں کہ مم میں انسان ہوں۔" میں نے مجبوراً جواب دیا اور گاڑی تیز رفتاری سے چلاتا رہا۔

"تو کیا میں انسان نہیں ہوں اور انسان خون نہیں پیتے کیا؟" بابا جی نے یک لخت دو سوال کیے۔

"نن نہیں!"

"جھوٹ کہتے ہو۔" اب بابا کی آواز ہر لمحے بدلتی جا رہی تھی۔

"ہاہاہا، میں تو پی رہا ہوں، تمہارا خون"

"میں انسان، ایک انسان کا خون پی رہا ہوں۔۔۔" انتہائی خوفناک آواز میں کہا گیا۔

"دیکھو مجھے چھوڑ دو! جو تم مجھ سے مانگو گے میں دوں گا، ہاں دوں گا۔" میں

بقیہ صفحہ نمبر 26 پر

ایک سچی کہانی

بیگم سیدہ ناجیہ شعیب احمد

قومی ترانے کی تیز آواز پر ان کی آنکھ کھلی۔ نماز فجر کے بعد وہ بڑی دیر تک تصور میں اماں ابا سے باتیں کرتے رہے تھے، ابھی تو ان کی آنکھ لگی تھی، حالاں کہ ان کا کمرہ سب سے الگ تھلگ بالکل کونے میں تھا۔ اسّی سالہ بوڑھے باپ کی شاید کسی کو ضرورت نہیں رہی تھی۔ صد شکر کہ انھیں گھر میں عزّت سے رکھا ہوا تھا۔ بچے انھیں بڑا بزرگ سمجھ کر خدمت بھی کرتے تھے، مگر۔۔۔ ان کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔

وہ بہ مشکل بستر سے اُٹھ کر کھڑے ہوئے اور ٹی وی لاؤنج میں چلے آئے، جہاں ایل سی ڈی اسکرین پر ایک نوجوان لڑکا گٹار اٹھائے بے ہنگم انداز میں چیخ چیخ کر گانا گا رہا تھا اور ان کے دونوں پوتے شناور، دلاور اور پوتی بختاور اس کے ساتھ ہم آواز ہو کر گلا پھاڑ کر اس کی تقلید کر رہے تھے۔ ان کی بہو ہما بھی کچن میں کھانے پکاتے ہوئے موسیقی کے ساتھ تھرک رہی تھیں۔ مشہود صاحب نے آگے بڑھ کر ریموٹ کنٹرول اٹھا کر آواز کم کر کے اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہوئے شناور سے پوچھا: ”میاں! یہ سب کیا ہے؟“

شناور چہکتے ہوئے بولا: ”دادا جی! پرسوں ۱۴ اگست ہے۔ ہمارے اسکول میں بہت بڑا فنکشن رکھا گیا ہے۔ جنگِ آزادی کے ہیرو مہمانِ خصوصی ہوں گے۔ بڑے نامی گرامی گلوکار اپنی یادگار پرفامنس دے کر پاکستانیوں کا لہو گرمائیں گے۔“

”اور اس گرینڈ فنکشن میں آپ کے دونوں ہونہار پوتے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تیاری کر رہے ہیں، اسٹیج پر سب کے سامنے پرفارم کریں گے۔“ ان کی مسز ہما تنویر لہجے میں دنیا بھر کی محبت سمیٹ کر بولیں۔

مشہود صاحب بجھ سے گئے۔

”دادا جی! آپ ہمیشہ یومِ آزادی پر اُداس اور غمگیں ہو جاتے ہیں، مگر اب نہیں! اب ہم بڑے ہو گئے ہیں اور آپ کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے، بہت مزہ کریں گے۔“ دلاور مزے سے بولتا ہوا دادا کے پاس آ کر ان سے ریموٹ لینے لگا، مگر مشہود صاحب کی گرفت سخت تھی۔

”ارے بھئی، اسٹیج پر قومی نغمے بھی تو پڑھے جائیں گے، تقریریں ہوں گی، علاقائی ناچ بھی ہوں گے۔“ بختاور کیوں پیچھے رہتی، آخر اس نے اپنے بابا تنویر الحق سے یومِ آزادی فنکشن کے لیے خصوصی طور پر ضد کر کے سندھی لباس اندورنِ سندھ سے منگوایا تھا۔

مشہود الحق نے غور سے اپنی نئی پود کو دیکھا اور پھر اپنے دل کی کتاب کھول کر بچوں کے سامنے رکھ دی۔ وہ کہتے گئے، بچے سنتے گئے، اپنی ماں جی کی شہادت، خالاؤں، پھوپھیوں کی بے حرمتی، بہن کا اغوا، ظلم و زیادتیوں کی ایک طویل داستانِ الم، اسلام کے نام پر ساری قربانیاں۔ وہ بنا رُکے سب کہتے گئے۔ بچے چپ تھے، کھوئے کھوئے تھے۔ اپنے پیارے دادا جی کے ساتھ آج وہ بھی رو رہے تھے۔

بچوں کی ماں نے آ کر زبردستی ان کے کمروں میں بھیج دیا۔

اگلے دن بچے یونہی افسردہ افسردہ اسکول چلے گئے اور مشہود الحق صبح سے شام تک اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے باہر کا شور سنتے رہے۔ ایک شور ان کے اندر کا، جو ان سب سے بھی تیز تھا۔ باہر چیختی چلاتی لڑکے لڑکیوں کی آوازیں تھیں، جو ڈیک پر قومی ترانے لگا کر محبِّ وطن پاکستانی ہونے کا حق ادا کر رہے تھے۔

گلیوں میں بنا سائلنسر کے موٹر بائیک چلاتے ہوئے جشنِ آزادی منانے والوں کا شور۔۔۔ اور اندر اندر بہت ساری ماؤں کی دردناک چیخیں تھیں، جن کے بچوں کو سکھوں نے اُچھال کر نیزوں کی نوکوں پر اٹھا لیا تھا، ان معصوم شیر خوار بچوں کی کلیجہ چیر دینے والی آوازیں تھیں، سکھوں کے جے کارے اور ہندوؤں کے نعرے تھے اور اس کے اندر لا الہ الا اللہ کی بازگشت گونج رہی تھی۔

”ابا جی بچے اب بڑے اور سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ آپ ہر 14 اگست پر غم زدہ ہو کر خود کو کمرے میں قید کر لیا کرتے تھے، پلیز اس مرتبہ ایسا نہیں کیجیے گا۔“

”اور للہ! میرے بچوں کو اپنے خاندان کی قربانیوں کی لازوال داستانیں اب نہیں سنائیے گا۔ میرے معصوم سے بچوں کو ڈرا کر رکھ دیا۔“ ہما تنویر جب سے بیاہ کر آئیں تھیں، سسر صاحب کو ماضی کے زخم تازہ کیے ہی دیکھا تھا۔

جب تک بچے نہیں تھے، ہما، سسر صاحب کے دکھڑے سن لیا کرتی تھیں۔ بچے ہوتے ہی ہما کو بوڑھا سسر کھلنے لگا۔ ہر وقت روتے رہتے ہیں بچوں پر کیا اثر پڑے گا؟

ایسا کب تک چلے گا؟

ہما کے کہنے پر ہی تنویر الحق نے اپنے ابا جی کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ آپ ہمارے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کریں گے اور ہماری خوشیوں میں خوش رہنے کی کوشش کریں گے اور مشہود الحق سر جھکا کر سر ہلاتے رہ گئے۔

”بچو! اس مرتبہ آپ کے دادا جی ہماری خوشی کے لیے ہمارے ساتھ جشنِ آزادی منائیں گے۔“

”یے، ہرّرے!!“

”اور ہمارے ساتھ رات کو شہر کی سجاوٹ دیکھنے بھی جائیں گے۔“ بچے اُچھل کود کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

شام تک ہر گلی محلّہ سبز ہلالی جھنڈیوں اور روشن قمقموں سے سجایا جا چکا تھا۔ محلے کی سب سے بڑی اور چوڑی گلی میں ایک اسٹیج بنا گیا تھا۔

اسٹیج پر بڑا سا ڈیک رکھا گیا تھا جو فل والیم میں بج رہا تھا۔

ڈیک پر قومی نغموں کے علاوہ انڈین فلموں کے گانے بھی گونج رہے تھے، جس پر قوم کے نوجوان لڑکے لڑکیاں رقص دکھا کر جشنِ آزادی منانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

گلی محلوں، سڑکوں ہر طرف لوگوں کا جمِّ غفیر تھا۔ اہلیانِ شہر، شہر کی رونق دیکھنے اور سج دھج کی داد دینے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ جوان بچیوں کی بے حجابانہ ادائیں، لڑکوں کی بے باک نگاہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ایک ریلا سا تھا، جو بے سمت بہے جا رہا تھا۔ اس ہجوم میں دست درازیاں، لوفر بازیاں دیکھ کر مشہود الحق کا کلیجہ چِر گیا۔

ایک آہ نکل گئی۔ انھوں نے اپنی ماں اور بہنوں کو جو پاکستان کے لیے قربان ہو گئیں تھیں، پکارا:

”ہائے اماں، آپا! یہاں تو کسی کے سر پر دوپٹہ ہے ہی نہیں، آپ لوگوں نے کس کے لیے اپنے دوپٹے، چادریں اتروادیں؟“

”یہاں کیوں رُک گئے بیٹا؟“ تنویر الحق نے گاڑی ویڈیو شاپ پر روکی تو مشہود الحق نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

”ابا جی! جشنِ آزادی کے موقع پر جنگِ آزادی کے حوالے سے خاص فلم ریلیز کی گئی ہے، وہی لینے جارہا ہوں، جو باتیں آپ سے سنتے آرہے ہیں، آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیں گے۔“

”آہ! مگر وہ درد، وہ اذیت محسوس کر پاؤ گے، جو ہم نے سہی تھیں؟“

انھیں اپنی اماں جان کی نصیحت یاد آئی، وہ کہا کرتی تھیں: ”مشہود الحق! کبھی کسی دشمن کی چیز مت خریدنا، ورنہ ان پیسوں سے جو گولی خریدی جائے گی، وہ تمہارے ہی سینے پر چلے گی۔“

ان کے کانوں میں اپنی شہید بیوی کی درد بھری آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ کہہ رہی تھی:

”ہائے تنویر الحق کے ابا! ہم ماؤں، بہنوں، بیٹیوں نے جس پاک دھرتی کی خاطر لاکھوں قربانیاں دیں، اپنی عصمتیں لٹوادیں، اس پاک دھرتی کے باسی آج خود دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کررہے ہیں۔ لاکھوں کا زرِ مبادلہ انھیں فراہم کررہے ہیں، وہ اپنے پنجے تیز کررہا ہے اور میرے بچے گٹار اُٹھا کر ناچ گانے میں لگے ہوئے ہیں، طبلے کی تال پر تا، تا، تھیا کررہے ہیں۔ میری بہو بیٹیاں محفلوں میں ناچتی ہیں اور میرے ہم وطن تالیاں بجا بجا کر انھیں داد دے کر خوش ہورہے ہیں کہ دیکھو! بالکل انڈین ہیروئنوں کی ڈانس کرتی ہیں۔“ تنویر مووی کی سی ڈی لے آیا تھا۔ گاڑی میں نئی انڈین فلم کا تذکرہ چھڑا ہوا تھا، وہ سب ہی خوش گوار موڈ میں گپ شپ کررہے تھے۔ کون اس اسّی سالہ بڈھے کی قلبی حالت پر دھیان دیتا۔ ان کے اندر سے اٹھتے شور پر کان دھرتا۔ ان کا دم گھٹنے لگا۔ ان کی بہو ہما کا کہنا تھا کہ ابا جی ہمیشہ اپنی طبیعت خراب کر کے ان کا جشنِ آزادی برباد کردیتے ہیں۔ بس! اسی خیال کے آتے ہی دھیان بٹانے کے لیے انھوں نے کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کردیا۔ سڑکوں کی دونوں جانب لگی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کررہی تھیں، مگر یکایک یہ روشنیاں باوردی دھماکوں میں بدل گئیں۔ ان کے آس پاس کشمیری بیٹیوں کی آہیں، غزّہ کے معصوم بچوں کی چیخیں گونجنے لگیں، یہ روشنی کے قمقمے نہیں انگارے ہیں۔

مشہود الحق کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو جھنجھوڑ کر بتائے: ”دیکھو! وہ دیکھو! صالحہ اغوا ہورہی ہے، وہ اُدھر دیکھو! عاصمہ کے سر سے چادر کھینچ کر اسے برہنہ کر کے دوڑایا جارہا ہے۔ ارے روکو! وہ میری آپا کی بے حرمتی کررہے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ہم مسلمان ہیں۔ لوگو! ان پیسوں کو ان کی مدد کے لیے بچا رکھو، ارے پہلے اپنے دشمن سے تو نمٹ لو، اپنی قوم کو عذاب سے نجات دلاؤ، پھر دل کھول کر جشنِ آزادی منانا، پھر جشنِ آزادی منانا!!!“ مشہود الحق پر پھر دورہ پڑا تھا۔

جان لیوا دورہ! تنویر الحق کی بیوی رشتے داروں کی ہم دردیاں سمیٹ کر دل ہی دل میں اپنے سسر کو کوس رہی تھی، جن کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر جشنِ آزادی منانے کا پروگرام کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔

مشہود الحق کمرۂ انتہائی نگہداشت میں پڑے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔

13 اور 14 اگست کی درمیانی رات جب گھڑی نے 12 بجائے عین اسی وقت مشہود الحق صاحب کے دل نے دھڑکنا بند کردیا۔

شہر میں پھلجھڑیاں اور پٹاخے چھوڑے جارہے تھے، ہر سو خوشی کے شادیانے بج رہے تھے، پاکستانی عوام خوش اور مسرور تھے۔

عالمِ ارواح میں کسی کی آمد کا چرچا تھا۔ چند شہدا روحیں بڑی بے چینی سے کسی کی منتظر تھیں۔

کون آنے والا ہے؟

مشہود الحق کی روح نے ایک اُمید اور آس کے ساتھ جسمِ فانی کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا اور عالمِ ارواح کی جانب پرواز کر گئی۔

بقیہ

خوف ناک سبق

اس کی منتیں کرنے لگا۔

”مجھے تمہارا خون چاہیے، دوگے؟ بولو دوگے؟“ ہاہاہاہاہا۔

”میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا، گاڑی قابو سے باہر ہونے لگی اور اب گاڑی الٹنے کے قریب تھی کہ میں نے اس وجود کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا، اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کو چھو رہا تھا اور پھر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔“ میری آنکھ کھلی تو میں صحیح سلامت اپنے بستر پر موجود تھا۔ ساتھ ہی میرا جگری دوست فواد کرسی پر بیٹھا تھا۔

”میں بچ گیا، میں بچ گیا!!!“ میں چھوٹے بچے کی طرح بولا تھا۔

”کیسے ہو میرے شیر؟“ فواد بولا۔

”اچھا ہوں، تم کیسے ہو؟“

”دیکھ لو، تمہارے سامنے ہوں۔“ فواد نے شوخیانہ جواب دیا۔

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“ جواب دیتے ہی میری نظر سامنے ٹیبل پر پڑی، ”ارے ے ے!! پھر!! یہ یہاں بھی؟؟“ میرے اوسان خطا ہوگئے، پھر وہی کیفیت میرا گھیراؤ کرنے لگی۔

”مجھے بچاؤ، وہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔“

”کوئی نہیں ہے یار۔۔۔“ فواد نے مجھے تسلی دی۔

”نہیں، وہ وہ سفید خون والی چادر اور وہ خالی بالوں والی یہ یہ یہاں کک کیسے آئی؟“

”ہاہاہاہا۔۔۔“ فواد مجھے دلاسا دے رہا تھا، میں خوف سے اسے تک رہا تھا۔

”اوہ! کہیں فواد کے روپ میں تو وہ شخص نہیں آگیا۔“ یہ بات ذہن میں آنی تھی کہ بس میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اب میں فوراً یہاں سے بھاگنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے! کہاں جارہے ہو دوست؟ اچھا ڈرومت، میں تمہیں ساری کار گزاری سناتا ہوں۔“ فواد مجھے روک کر گویا ہوا تو مجھ پر واضح ہوا کہ میں غلط سوچ رہا ہوں یہ فواد ہی ہے۔

میں آفس سے واپس جارہا تھا تو مجھے پتا چلا کہ آج تمہیں بھی آفس سے دیر ہوگئی ہے، سو میں نے آج تمہیں ایک سبق دینے کی ٹھانی جو کہ میں نے ایک عرصہ سے سوچ رکھا تھا۔ آج اچھا موقع تھا، میں راستے میں روپ بدل کر کھڑا ہوگیا اور۔۔۔ فواد نے ساری کہانی میرے گوش گزار کی اور میں حیران بت بنا اسے سنتا رہا۔

”اور وہ سفید چادر اور خون کا کیا چکر ہے؟“ میری اچانک چادر پر نظر گئی تو میں نے پوچھا۔

”وہ تو میری ہی چادر تھی، جسے میں نے چھپکے سے آگے والی سیٹ پر پھینک دیا تھا اور آفس میں میرے ہاتھ سے گلاس ٹوٹ گیا تھا جو کہ میری انگلی میں لگ گیا، جب میں تمہاری گاڑی میں بیٹھا تو پھر سے خون جاری ہوگیا۔ سو میں نے اسے چادر پر چھڑک دیا جو تمہیں ڈرانے میں معاون ثابت ہوا۔

”اوہ!!!“ اب تک میں خوف سے نکل چکا تھا اور میرے بھائی بھی نجانے کب ساتھ آبیٹھے اور تجسّس سے ساری کار گزاری سن کر محظوظ ہورہے تھے۔

”دیکھو یار! ہم سب نے تمہیں بہت سمجھایا، مگر تم نہیں سمجھے، پر مجھے تو اپنے دوست کو یہ سبق سکھانا تھا اور کچھ چیزوں کا جب تک انسان مشاہدہ نہیں کرلیتا اسے وہ سمجھ نہیں آتیں۔“ مجھے امید ہے دوست! تم نے اس سبق کو اچھے سے ذہن نشین کیا ہوگا اور آیندہ تم انسان، جگہ، وقت، حالات ہر چیز کی تحقیق کے بعد کسی کو گاڑی میں بٹھاؤ گے۔ فواد روانی سے بولا۔

”سبق تو یاد ہوگیا ہے، اب اس سبق کو کیا نام دوں ماسٹر جی؟“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”خوف ناک سبق۔“ فواد بالکل اس بوڑھے کی طرح آواز نکالتے ہوئے بولا اور سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

ساتھ ہی میں دل ہی دل میں اس خوف ناک سبق کے حصول پر شکر گزار ہورہا تھا۔

عالمی ادارہ

بیت السلام

ویلفیئر ٹرسٹ

BAITUSSALAM

2200+

یتیم بچے زیرِ کفالت

رہائش، خوراک، تعلیم و تربیت

Saiban

FOR ORPHANS

BAITUSSALAM

بلاعنوان

انیسہ عائش

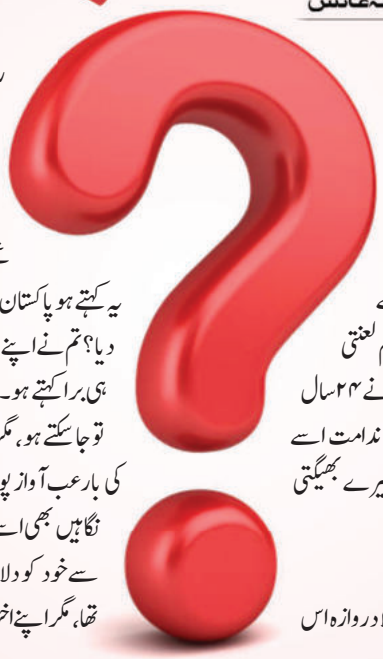

زور دار تالیوں کی گونج اور کیمروں کی روشنی میں دانیال اسٹیج پر پہنچا، جہاں ڈین آف فیکلٹی آف کمپیوٹر سائنسز پروفیسر جیمز نے دانیال کو ایوارڈز پیش کیے۔

1. یونی ورسٹی آف مانچسٹر انٹرنیشنل اسٹوڈنٹ اچیومنٹ ایوارڈ
2. دی فیکلٹی آف کمپیوٹر سائنسز آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ایوارڈ
3. دی ڈینز ایوارڈ فار اکیڈمک ایکسی لینس

ان ایوارڈز کو وصول کرتے ہوئے دانیال کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ آخر اس کی طویل جدوجہد کے بعد اب انعام لینے کا وقت آن پہنچا تھا۔ حاضرین کی تالیوں کی گونج ایک بار پھر سے گونجتی چلی گئی۔ تقریب کے اختتام پر لنچ رکھا گیا تھا، جس میں دانیال اور ڈین صاحب مدعو تھے۔ یہ لنچ مانچسٹر کی اُبھرتی ہوئی ٹیکنالوجی فرم ''انووٹیک سولیوشنز'' کے سی ای او مسٹر داؤد کی جانب سے تھا۔ انھوں نے دانیال کو اس کی کام یابیوں پر مبارک باد دی اور مانچسٹر میں اپنی فرم میں سوفٹ ویئر انجینئر کے طور پر جاب کی پیشکش رکھی۔ ڈین صاحب اس جاب سے جڑی شان دار مراعات کی طرف اس کی توجہ دلا رہے تھے۔ خوشی سے یک بارگی اس کا دل دھڑکتا چلا گیا، مگر اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے ان سے سوچنے کا وقت مانگ لیا۔

زہر یلے الفاظ سیال بن کے اس کی سماعتوں میں بہ رہے تھے۔ اسے اپنا دَم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اپنے لگژری اپارٹمنٹ کے شان دار لان میں نکل آیا، مگر کھلی فضا اور تازہ ہوا کی تازگی بھی اس کے اندر کی گھٹن کم نہ کر سکی۔ الفاظ کی بازگشت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ تم لعنتی گندے خون والے پاکستانی! تم اپنے ملک کیوں نہیں چلے جاتے؟ تم ہمارا کلچر چرا رہے ہو، ہماری جاب اور ہمارے ہی طریقے، تم لعنتی ہو اور پھر ایک مضبوط بارعب لہجہ ان آوازوں پر غالب آ گیا۔ اس وطن نے ۲۴ سال تمہیں پالا، تم نے اس کے لیے کیا کیا؟ تم پچھتاؤ گے۔ شرمندگی اور ندامت اسے گھیرے میں لینے لگی، یوں ہی بے چینی اور اضطراب میں دھیرے دھیرے بھیگتی رات گزر گئی۔

پُرکشش تنخواہ پُرآسائش زندگی اور کام یاب مستقبل، گویا ترقی کا کھلا دروازہ اس کا منتظر تھا۔ دل تو کہتا تھا لمحے کی دیری کیے بنا قبول کر لو، مگر اندر کہیں ایک کشمکش سی تھی۔ ایک اُلجھن یا شاید ضمیر کی آواز جو آڑے آ رہی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر سوچوں کو جھٹکا اور آج شام کے ڈنر کی تیاری کرنے لگا، جو مانچسٹر کی معروف کاروباری شخصیت کی جانب سے تھا۔

ڈنر کے بعد وہ لان میں چلے آئے۔ وہاں دو کرسیاں رکھی تھیں۔ دانیال بھی ان کی تقلید میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مسٹر داؤد کی پیشکش کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟'' انھوں نے سوال کیا۔ ''آپ کے خیال میں کیا سوچنا چاہیے؟'' اس نے جواباً سوال کیا۔ اس کی پُرسوچ نظریں ان کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ انھوں نے ایک گہری سانس بھری: ''میں تمہیں ایک لڑکے کی کہانی سنانا چاہتا ہوں، شاید تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے۔''

''میں ضرور سننا پسند کروں گا۔'' یہ کہانی 10 سال پہلے کی ہے۔۔۔۔۔۔

''پاکستان کبھی ترقی نہیں کر سکتا، لوگوں میں قانون پر عمل درآمد تو ہے ہی نہیں، کوئی شعور ہی نہیں ہے۔'' ٹریفک جام کی وجہ سے گھنٹہ بھر ذلیل ہونے کے بعد علی جلا بھنا سا گھر پہنچا تو اس کی فرائے بھرتی زبان پاکستانیوں کے قصیدے گا رہی تھی۔ امی نے اسے ٹھنڈا شربت کا گلاس پکڑایا، مگر اس کا غصہ اور تأسف کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ سارے گھر والے اس کی طبیعت سے واقف تھے، وہ اس کے الفاظ کو جذباتیت پر محمول کرتے۔ وہ پاکستان میں گیس اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ، تعلیم کی کمی، انصاف کی عدمِ فراہمی، لاقانونیت، لاعلمی، جہالت اور معاشی تنگی پر افسوس کرتا اور تبصرے کرتا ہوا پایا جاتا۔ بات فکر مندی اور تأسف تک رہتی تو ٹھیک تھی، مگر گزشتہ کئی ماہ سے نئے دوستوں کی صحبت سے اس میں عجب سی تبدیلی در آئی تھی۔ اس کی فکر مندی اور تأسف رفتہ رفتہ بیزاری اور تنفر میں بدلنے لگی تھی۔ جب اس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جانے کی اجازت مانگی تو سب گھر والے حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ اوسط درجے کا اپنی روایات سے محبت کرنے والا محبِ الوطن قسم کا گھرانہ تھا۔ بات صرف اعلیٰ تعلیم کے حصول تک رہتی تو خیر تھی، مگر اس نے واضح کر دیا تھا کہ اسے اپنا مستقبل پاکستان کی بجائے بیرونی ملک میں نظر آتا ہے اور اس کا مستقل طور پر وہاں ہی سیٹل ہونے کا ارادہ ہے۔ ابا جی کا چہرہ شدّتِ اہانت سے سُرخ پڑ گیا۔ ''رات دن تمہارے منہ سے پاکستان کی برائیاں سنتے آئے تھے، ہم اسے اپنے وطن سے محبت اور فکر مندی سمجھتے آئے تھے، اگر تم یہ کہتے ہو پاکستان نے تمہیں یہ نہیں دیا، وہ نہیں دیا۔ کبھی سوچا ہے تم نے پاکستان کو کیا دیا؟ تم نے اپنے وطن کے لیے کیا کیا؟ 24 سال سے اسی ملک کا کھاتے آ رہے ہو، اسے ہی برا کہتے ہو۔ ہماری طرف سے تمہیں اجازت ہے، تم ہمیشہ کے لیے جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو، مگر میری بات یاد رکھنا! تم خالی ہاتھ رہو گے، تم پچھتاؤ گے۔'' ابا جان کی بارعب آواز پورے گھر میں گونجتی چلی گئی، پھر سب کے اترے ہوئے چہرے، ملتجی نگاہیں بھی اسے نہ روک سکیں اور وہ ان سے نظریں چرائے دماغ کی گھسی پٹی دلیلوں سے خود کو دلاسہ دیتا برطانیہ چلا آیا۔ اسے یونی ورسٹی آف مانچسٹر میں داخلہ مل گیا تھا، مگر اپنے اخراجات کے لیے اسے جاب کرنا تھی۔ اسے اپنے بل بوتے پر کچھ بن کر دکھانا تھا، اسے اپنے والد کو غلط ثابت کرنا تھا، مگر یہاں اسے پتا چل گیا کہ باپ کے پیسوں پر بیٹھ کر کھانا اور تھا، مگر یہاں خود کمانا اور تھا۔ اس نے بہت سے کام کیے کار واشر، ویٹر، اسسٹنٹ ہر وہ کام جو پاکستان میں وہ حقارت کی نظر سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔ رات دن ایک کر کے اس نے اپنی سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ وہ آہستہ آہستہ ترقی کے زینے پار کرتا چلا گیا۔ اس نے گرومنگ کے کورس کے ذریعے سر تا پیر خود کو یہاں کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ برطانوی شہریت حاصل کر لی۔ دس سال سے اس ملک کے تمام قانونی تقاضے پورے کرتا، ایک مہذب شہری تھا۔ یہاں کے سماجی اور معاشرتی اور رفاہی حلقے میں اس کا ایک مثبت نام تھا، مگر اس کے باوجود اس نے اس عرصے میں کئی بار محسوس کیا یہاں کے کچھ باشندے اس سے دوسرے درجے کے شہری جیسا سلوک کرتے تھے اور جو اس کی بااثر کاروباری حیثیت کی وجہ سے کھل کر اپنی نفرت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ گویا پاکستان

اس کہانی کا بہترین عنوان منتخب کرنے پر تین سو روپے انعام دیا جائے گا
عنوان منتخب کرنے کی آخری تاریخ 12 اگست ہے۔

کا حوالہ اس کے لیے باعثِ فخر ہونے کی بجائے احساس کم تری دلاتا۔ اک بے چینی اور اضطراب کی لہر اس کے اندر دوڑتی چلی جاتی، مگر وہ ایسے مواقع پر اپنے تاثرات کو چھپا لیتا۔ وہ اعلیٰ درجے کا ضبط رکھتا تھا، مگر اس دن تو حد ہی ہو گئی، وہ معمول کے مطابق شہر کے وسط میں بنے اپنے مارٹ کے دورے پر تھا کہ ایک برطانوی باشندہ سرخ چہرہ لیے اس پر چلانے لگا: ”گندے پاکستانی! گندے خون والے اجنبی! اپنے ملک میں واپس جاؤ، اپنے ملک میں کیوں نہیں واپس جاتے؟ تم چور ہو۔ تم ہماری نوکریاں، ہمارا کلچر، ہمارا بزنس کا طریقہ چرا رہے ہو۔ چور، گندے خون والے! اپنے ملک واپس جاؤ۔“ وہ غصے میں بھپرا ہوا اس پر جھپٹا تھا۔ قریب تھا کہ وہ علی کا گریبان پکڑ لیتا کہ وہاں پر موجود گارڈز تیزی سے پکڑتے اسے دور ہٹا لے گئے، مگر اس کے چیخنے اور پاکستان کو گالیاں دینے کی آواز دور تک سنائی دیتی رہی۔ علی نے جون کے خلاف پولیس ڈپارٹمنٹ میں شکایت درج کروائی۔ پولیس نے فوری ایکشن لیا اور جون کو اس کے رویے پہ جرمانہ عائد کر دیا گیا۔ اگرچہ لوگوں نے جون کے اس رویے کی مذمت بھی کی، مگر علی کو اس واقعے نے شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اپنی تمام اپوائنٹمنٹس کینسل کر دیں۔ درد کی لہر اس کے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔ اس نے 10 سال اپنی تمام تر وفاداری، محبت اور توانائی اس وطن کی ترقی اور خوش حالی کے لیے خرچ کر دی تھی، مگر وہ پھر بھی اجنبی ہی ٹھہرا۔ اسے اپنے والد کی باتیں شدّت سے یاد آ رہی تھیں۔ اگر میں اس قدر ان تھک محنت اپنے وطن کے لیے سر انجام دیتا تو کیا ہوتا۔ میں تو احسان فراموش ہوں، اتنے سال تک جس سر زمین نے مجھے اس قابل بنایا اپنا نام دیا، اس کے لیے میں نے کیا کیا؟ اسی وطن کو گالیاں دلوائیں۔ اس کا ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ملک کو گالیاں دی گئی تھیں۔ اسے خود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

علی صاحب کا گلا رندھ گیا۔ دانیال نے پانی کا گلاس بھر کر انھیں تھمایا۔ ان پر رِقّت طاری تھی۔

دانیال کا دل بھی بھر آیا تھا۔ وہ پانی پی کر اپنے حواس پہ قابو پاتے ہوئے بولے: ”جب میں نے تمھیں دیکھا تو مجھے لگا تاریخ خود کو دہرانے چلی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری کہانی کو مت دہراؤ۔ تمھیں ضمیر کی خلش کبھی بھی چین نہیں لینے دے گی۔ جب تم سے پوچھا جائے کہ تم نے اپنے وطن کے لیے کیا کیا تو تم جواب دے سکو۔ مجھے تم میں اپنا عکس نظر آتا ہے، اس لیے میں نے تمھیں اپنی زندگی کی کہانی کہہ سنائی، آگے فیصلہ تمھارا ہے۔“ دانیال کو لگا کہ جیسے اس کے ذہن میں چھائی ہوئی دھند چھٹ گئی ہو۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کئی دن سے طاری الجھن سے چھٹکارا مل گیا تھا۔

اس نے اگلی صبح اپنا فیصلہ مسٹر داؤد کو جا سنایا۔ انھوں نے اس کو ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے کسی پاگل یا دیوانے کو سامنے کھڑا پا رہے ہوں اور اسے نظرِ ثانی کی دعوت دی۔ دانیال نے پاکستان کی ٹکٹ بک کروائی۔ اسے اپنے ہم وطنوں اور سر زمین کی یاد آ رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کر پاکستان جا پہنچے۔ روانگی سے دو دن قبل وہ علی صاحب کی طرف چلا آیا۔ اس نے ان سے پاکستان کی ڈھیروں باتیں کیں۔ اپنی سر زمین کی یاد میں ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

دانیال نے ان کو رضامند کر کے ہی چھوڑا کہ بہت کاٹ لیا ہجر، اب وقتِ وصال آ پہنچا۔ اگلی صبح ان کا جہاز پاکستان کی جانب اُڑان بھر رہا تھا۔ دانیال سوچ رہا تھا کہ پاکستان پہنچ کر علی صاحب کے گھر والوں کو ڈھونڈنا ہے اور انھیں بتانا ہے کہ ”صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“

علی نے ایک نظر دانیال کی پُر سوچ پیشانی پر ڈالی گویا، اس کی سوچ پڑھ لی ہو، پھر مسکرا کر سر سیٹ کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں موند لیں۔

مادرِ وطن اپنی پُر شفقت باہیں پھیلائے ان مہاجروں کے استقبال کے لیے منتظر تھی۔

ہم کہاں قرآن کی نعمت کہاں

مہوش اسد شیخ

کر سکے تیرے کرم کو جو بیاں
لاؤں اے مولا کہاں سے وہ زباں
ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے جہاں
کر کے پیدا سات ارض و سماں
وہ شرف بخشا گیا انسان کو
تھا فرشتوں کو نہیں جس کا گماں
انبیا بھیجے قطار اندر قطار
کیا ہی اچھے سے چلایا کارواں
پھر ہوا حضرت محمد ﷺ کا ظہور
جس کی خاطر تھا بنایا کل جہاں
امتی پیدا کیا محبوب کا
ہم کہاں، قرآن کی نعمت کہاں
شکر اس کا کر نہ پاؤں گی ادا
اس قدر ہے اے مشیؔ وہ مہرباں

قانتہ رابعہ

مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

انور صاحب کی کام والی ماسی بہت بیمار رہنے لگی تھیں، کچھ عمر بھی ساٹھ سال سے اوپر ہی ہو گی، بیس بائیس سال سے مسلسل انور صاحب کے ہاں مقیم تھیں۔ اتنا لمبا عرصہ ایک ہی جگہ پر رہنے سے وہ ملازمہ کم اور گھر کی فرد زیادہ لگتی تھیں۔

جب آئی تھیں تو بھاگ بھاگ کر سب کے کام کرتیں، تب خیر سے انور صاحب کی شادی کو دو ایک سال ہوئے تھے، گھر میں افراد ہی کتنے تھے۔ انور صاحب، ان کی بیگم، ان کی ایک سال کی بیٹی، ان کی دو بہنیں اور والدہ! انور صاحب کی ملازمہ جنہیں سب آپا منیراں کہتے قریبی گاؤں سے آئی تھیں۔

دو ڈھائی سالوں میں انھیں گھر کے ہر فرد کی پسند ناپسند اور کاموں کا بہت اچھی طرح سے پتا چل گیا تھا۔ برتن دھونے کے بعد الٹے رکھتے ہیں، پھر صاف کپڑے سے خشک کرتے ہیں، کپڑے کیسے دھوتے ہیں، کھانا کیسے پیش کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ انھیں ہر کام سمجھ میں آ گیا اور انور صاحب کی بیگم پوچھا کرتی تھیں کہ منیراں آپا یہ کام کیسے کرتے ہیں؟

انور صاحب کی بڑی بیٹی ثوبیہ کے بعد اللہ نے تین بچے اور دیے سب سے چھوٹے کا نام علی احمد تھا۔ بہت لاڈلا اور ضدّی طبیعت کا مالک جب وہ پیدا ہوا تو منیراں آپا بیمار رہنے لگی تھیں۔ بہت علاج کروایا، ٹھیک ہو جاتی تھیں لیکن کچھ دنوں کے لیے، پھر بیمار ہو جاتیں۔ اب ان سے کام بھی نہیں ہوتے تھے، جو کام شروع کرتیں شام تک لٹکتا رہتا اور ان سے کام کہنے کو دل بھی نہیں مانتا تھا، بھلا بیمار تو اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتا، وہ کسی کو کیا سنبھالے گا۔ بچوں کی وجہ سے کام بھی بہت بڑھ گیا تھا۔

پھر آپا منیراں نے کام سے خود ہی انکار کر دیا اور کہا سال چھ ماہ کے لیے گاؤں واپس چلی جاتی ہوں، جب تندرست ہو جاؤں گی تو واپس آ جاؤں گی۔

جاتے جاتے انھوں نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ گاؤں سے اپنی بھانجی کو کام کے لیے بلوا لیا۔

آپا منیراں تو چلی گئیں، لیکن جو کام والی لڑکی انھوں نے بلوائی تھی، اس کا نام صغریٰ تھا، دبلی پتلی سانولے رنگ کی۔۔۔

ہر وقت خاموش رہنے والی دیکھنے میں جتنی چپ چاپ رہتی کاموں میں اتنی ہی پھرتیلی تھی، یوں بھاگ بھاگ کر کام کرتی کہ سب حیران رہ جاتے۔

ابھی صغریٰ برتن دھو رہی ہے، ابھی کپڑے استری کر رہی ہے، انور صاحب کے جوتے پالش ہو رہے ہیں، دروازے پر گھنٹی کی آواز سنائی دیتی تو پلگ جھٹکنے میں دروازے پر پہنچ جاتی۔

آتے ہی ہر کام اس نے منٹوں سیکنڈوں میں سیکھ لیا۔

سب نے صغریٰ کے آنے پر سکھ کا سانس لیا۔

بس اس کے دو مسئلے تھے:

اس کا میاں سبزی منڈی میں ریڑھی پر سبزیاں لانے لے جانے کا کام کرتا تھا تو صغریٰ نے ایک کچے پکے کمرے کا گھر کرائے پر لیا تھا، جہاں سے وہ آتی تو دس بج چکے ہوتے۔

دوسرا یہ کہ اس کے ساتھ اس کا اکلوتا بیٹا عابد ہوتا، چھ سات سال کی عمر کا یعنی علی احمد سے سال ڈیڑھ چھوٹا۔۔۔ جب علی احمد سکول سے تھکا ہوا آتا تو پہلی نظر عابد پر پڑتی، گندے کپڑے، بڑھے ہوئے ناخنوں میں کالی سیاہ میل، گہرا سانولا رنگ، پیلے بڑے بڑے دانت میل کی تہیں جم جم کر بال جھاڑو کے تنکے کی طرح اوپر کی طرف کھڑے ہوتے، ہر وقت ماں کی قمیص کو پکڑ کر ساتھ ساتھ رہتا اور ریں ریں باجا بجاتا۔

اوپر سے بہتی ہوئی ناک جسے وہ اپنی قمیص کی آستین سے صاف کرتا تو دیکھنے والوں کے جی متلانے لگتے۔

انور صاحب کی بیگم بہت دفعہ اسے سمجھا چکی تھیں۔

"صغریٰ! صاف ستھرے رہا کرتے ہیں۔ میلے کپڑے اور گندے انسان کسی کو اچھے نہیں لگتے۔"

روز روز کے سمجھانے سے صغریٰ خود تو نہا دھو کر آتی، لیکن بیٹے کا وہی حال! اسے دیکھ کر سب سے زیادہ غصہ علی احمد کو آتا تھا۔

"امی اسے کہیں یہ ہمارے گھر میں نہ آیا کرے۔"

"تو اور کہاں جائے؟ کیا گھر میں اکیلے کو تالا لگا کر آئے! بری بات ایسے نہیں کہتے۔" وہ سمجھاتیں۔

"تو پھر اس گندے عابد سے کہیں دانت صاف کر کے منہ دھو کر نہا کر آیا کرے۔" وہ مشورہ دیتا

امی بچے کو بلا کر سمجھائیں، لیکن اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

جب اس کا باجا ریں ریں کر کے بجنا شروع ہوتا، اس کی ماں اسے پاپڑ، کرکرے اور لالی پاپ پکڑا دیتی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر کچڑ کچڑ کی آواز سے کھاتا اور علی احمد چڑ کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیتا، نہ عابد پر اثر ہوتا نہ علی باز آتا۔

علی چیختا: "مجھے اس کے گندے کپڑوں سے بو آتی ہے، مجھے اس کی طرف نہیں دیکھنا، اسے کہیں گیٹ کے پاس بیٹھا کرے، گھر کے اندر نہ آیا کرے۔"

اس پر صغریٰ پر امان جاتی، جب انور صاحب کی بیگم اسے سمجھاتیں تو وہ رونے لگ جاتی اور کہتی:

"بیگم صاحبہ! آپ خود بتائیں میں مغرب کے بعد گھر جاتی ہوں، ٹھیک ہے کھانا آپ دیتی ہیں، لیکن جاتے ہی سو کام کرنے والے ہوتے ہیں، اس کا ابا گھر میں ہوتا ہے، دھونے والے برتن اور کپڑے روز ہی جمع ہوتے ہیں۔ بتائیں میں کیا کروں؟ کبھی اسے قہوہ بنا کر دیتی ہوں، کبھی چائے، کبھی لسی، کبھی پانی اور ساتھ ساتھ اس کی دوادارو بھی۔۔۔ دو سال ہو گئے منحوس کھانسی جان نہیں چھوڑتی۔ جاتے ہی اسے کہتی ہوں نہا لے! مجال ہے جو بات مان لے۔ اوّل درجے کا ڈھیٹ ہے۔ جاتے ہی گلی میں نکل جاتا ہے۔ سونے کے وقت گرتا پڑتا گھر داخل ہوتا ہے۔"

صغریٰ روز ہی ایک جیسی کہانی سناتی۔

موسم گرما کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو انور صاحب کی بڑی بیٹی ہاسٹل سے واپس آ چکی تھی۔

ویسے بھی اس کی پڑھائی مکمل ہو چکی تھی، بس اب رزلٹ کا انتظار تھا۔

اس نے گھر میں جب یہ دونوں طرف سے خراب معاملہ دیکھا تو علی احمد کو ایک طرف لے گئی، اسے کچھ سمجھایا نہ۔ برا بھلا

بقیہ صفحہ نمبر 32 پر

”آپی! چلیں تیار ہو جائیں، پارٹی میں جانا ہے۔“ مہوش نے کہا۔
”کون سی پارٹی؟ کب ہے؟ کہاں ہے؟“ سارہ نے حیرانی میں پوچھا۔
”آپی بتایا تو تھا آپ کو! کنول کے گھر باربی کیو پارٹی ہے۔ بہت مزہ آنے والا ہے، اوپر چھت پہ انتظام کیا ہوا ہے انھوں نے اور میوزک بھی ہوگا، چلیں جلدی کریں تیار ہو جائیں۔“ مہوش نے بھویں مٹکاتے ہوئے کہا۔
”مردوزن اکٹھے؟“ حیرت سے سارہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
”چلو بھئی! اب اتنی ملانی بھی نہ بنو۔“ مہوش نے کہا اور آگے چل دی۔
”اتنا زیادہ بُرا اعتماد نہ ہو، اگر تم اسلام کے بارے میں نہیں جانتی تو۔۔۔“ سارہ بولی۔
”امی ہی سمجھائیں گی آپ کو!“ مہوش نے کہا۔
”امی کہاں ہیں آپ؟ آپی نہیں مان رہی، آپ ہی سمجھا دیں۔“ (مہوش دور دور سے ہی زور زور سے بولتی ہوئی جا رہی تھی۔)
”کیا نہیں مان رہی! اُف اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے!“ امی نے جھنجھلا کر کہا۔
”بیٹا! اٹھو تیار ہو جاؤ، ہمیں جانا ہے۔“ امی نے سارہ سے کہا۔
”امی! وہاں مردوزن کا اختلاط ہو گا؟“ سارہ نے اپنی امی سے کہا۔
”ہاں شاید! تو کیا سب بھاگ جائیں؟“ امی نے غصیلے انداز میں کہا۔
”بس صحیح ہے، پھر میں نہیں جا رہی، میں اس طرح کی محافل میں جانا پسند نہیں کرتی۔“ سارہ نے فوراً سے جواب دے دیا۔
”کیا ہو گیا ہے تمہیں، پہلے تو اس طرح نہیں کہتی تھی؟“ امی نے کہا۔
”جی امی! جب سے اپنے دین کو جاننا شروع کیا ہے، تب سے۔“ سارہ بولی۔
”تو کیا دین تمہیں ہر کسی سے کٹ کے رہنا سکھاتا ہے؟“ امی نے غصہ کیا۔
”نہیں، دینِ اسلام صرف گناہوں سے دور رہنا سکھاتا ہے۔“ مثبت جواب۔
”تو پارٹی میں چلنے پہ گناہ کیا ہے؟“ امی نے بلند آواز سے کہا۔
”ٹھیک ہے، پھر عبایا اور نقاب پہنوں گی۔“ سارہ اپنے مزاج پر قائم رہی۔
”خبردار جو میری ناک کٹوائی ہے تم نے!“ سارہ کی والدہ نے اتنے کڑک لہجے میں بولا تھا کہ سارہ ہِل کے رہ گئی۔
”تو امی میں پھر کیا کروں؟“ (دکھ، بے بسی اور بے زاری کی ملی جُلی کیفیت تھی اس کی)
”ویسے ہی تیار ہو کہ چلو، جس طرح مہوش چلتی ہے۔“ امی کا اصرار
”سوری امی! میں اس طرح نہیں چل سکتی۔“ سارہ نے جواب دیا۔
”تمہارا دین تمہیں ماں کی نافرمانی کرنا سکھاتا ہے؟“ امی نے کہا۔
”امی! میں آپ کی نافرمانی کہاں کر رہی ہوں؟ میں صرف اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ سارہ بولی۔
”آپی نے تو جب سے دین پڑھا ہے، پتا نہیں انھیں کیا ہو گیا ہے؟“ مہوش بھی حیران سی تھی۔
”جب بات سمجھ میں نہ آئے تو بیچ میں بولنا نہیں چاہیے، ماحول کو کیوں خراب کر رہی ہو؟“ سارہ نے بہن کو جھاڑا۔
”رہنے دیں امی آپی کو یہیں پہ۔! اکیلی ہو جائیں گی تو خود ہی اندازہ ہو جائے گا انھیں کہ دنیاداری کیا ہوتی ہے۔ ہر وقت دین، دین، دین۔۔۔ ہم تو جیسے مسلمان ہی نہیں ہیں۔“ مہوش بول کر آگے بڑھ گئی۔
”فضول بولنا ضروری تھا؟“ ایک اور جواب بہن کو۔۔۔
”تمہیں تمیز نہیں ہے سارہ؟ اس طرح بات کرتے ہیں چھوٹی بہن سے! ٹھیک ہے، مطلب نہیں چل رہی تم؟“ امی نے پُرجوش انداز میں کہا۔
”نہیں امی!“ دوٹوک جواب۔
”ابھی تو یہاں اکیلی رہ جاؤ گی، لیکن اگر یہی سلسلہ رہا تمہارا تو پوری دنیا میں اکیلی رہ جاؤ گی، یہ یاد رکھنا!“ (الفاظ بہت سخت تھے، بجلی بن کر گرے تھے سارہ پر)
”جو اللہ کے ساتھ کو پا لیتا ہے، وہ کبھی اکیلا نہیں رہتا۔“ سارہ نے کہا۔
”بڑی بڑی باتیں کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، یہ دنیا ہے، یہاں دنیاداری چاہیے، سوچ لو!“ امی نے کہا۔
”سوچ لیا۔“ سارہ بول کر خاموش ہو گئی۔
سارہ کی امی نے زور سے دروازہ بند کیا اور مہوش بھی ساتھ تھی۔ سارہ کو سمجھ نہ آیا کہ اس کا قصور کیا ہے! اس کے بعد کئی دنوں تک سارہ کی والدہ کا رویہ سارہ کے ساتھ سخت ناراضی والا تھا۔ سارہ ایک دن اپنی امی کے کمرے میں گئی:
”السّلام علیکم امی! میں اندر آؤں؟“ سارہ نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔
”ممم!“ امی نے سارہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
”امی آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟ آپ کی ناراضی مجھے پریشان کر رہی ہے۔“ سارہ گویا ہوئی۔
سارہ کی والدہ بیڈ پہ پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور سارہ اپنے گھٹنوں کے بَل اپنی والدہ کے پاس ہی بیٹھ گئی اور اپنی امی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔
”بیٹا! مجھے تمہارا یہ پردہ پسند نہیں ہے، تم نماز، روزہ اور تلاوت کرتی ہو، میں نے کبھی منع نہیں کیا، لیکن یہ پردہ۔۔۔“ امی کہتے کہتے رک گئی۔
”امی! جیسے نماز روزہ فرض ہے، ویسے ہی یہ پردہ بھی ضروری ہے۔ مجھے اللہ سے حیا آتی ہے کہ میں اس کی نافرمانی کروں۔“ سارہ نے مطمحِ نظر بیان کیا۔
”بیٹا! تم ابھی چھوٹی ہو، تم نے دنیا نہیں دیکھی، تمہیں نہیں پتا یہاں کیسے رہتے ہیں!“ امی نے سمجھانے کی کوشش کی۔
”جی امی! میں نے دنیا نہیں دیکھی، لیکن جس نے دنیا بنائی ہے، اس کو تو سب معلوم ہے نا!“ سارہ نے ماں سے کہا۔
”اس میں کیا تھا اگر تم پارٹی میں چل لیتی؟ سب پوچھ رہے تھے تمہارا!“ امی نے استفسار کیا۔
”امی! میرا ضمیر گوارہ نہیں کرتا کہ میں یوں تیار ہو کہ چلوں باہر، میرا دل مجھے اجازت ہی نہیں دیتا۔“ سارہ روہانسی ہو گئی۔
”ہمم!“ انداز سے غصہ صاف ظاہر تھا۔
”امی! آپ مجھے اپنی شفقت سے کیوں محروم کر رہی ہیں؟ ہم نے کئی دنوں سے باتیں بھی نہیں کیں۔“ سارہ اپنی والدہ کے رویے کی وجہ سے رونے جیسی ہو گئی تھی۔
”بیٹا! مجھے نیند آ رہی ہے، جاتے ہوئے دروازہ بند کر دینا۔“ سارہ اپنی امی کی اس بے رخی سے دُکھی تو ضرور ہوئی، لیکن صبر کا دامن نہ چھوڑا اس نے وہ دل ہی دل میں

دین کیا سکھاتا ہے!

عائشہ شیخ

سوچ رہی تھی کہ آخر میرا قصور کیا ہے؟

اور دن یوں ہی گذرتے رہے، ایک دن سارہ کی امی کو تیز بخار ہو گیا۔

"امی! آپ کو تو تیز بخار ہو رہا ہے، آپ آرام کریں۔" اور ساتھ میں وہ اپنی امی کے پاؤں بھی دباتی رہی اور ماتھے پہ پٹیاں بھی رکھتی رہی۔

"بیٹا! مہوش کو بلاؤ، کچھ وہ کر لے تم سب سے خدمت کر رہی ہو۔" امی نے سارہ کو سراہتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں امی! میں کر رہی ہوں نا خدمت۔" سارہ کو امی کر خدمت کا موقع مل گیا تھا۔

"بیٹا! مہوش کو بُلا لاؤ۔" امی نے پھر کہا۔

"جی!" سارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مہوش! امی بلا رہی ہیں تمہیں، امی کو تیز بخار ہے۔" سارہ بوتے ہوئے مہوش کے کمرے کی جانب بڑھی۔

"میں مصروف ہوں۔" مہوش نے جواب دیا۔

"امی سے بڑھ کر کیسی مصروفیت؟" سارہ نے حیرت میں کہا۔

"تنگ نہیں کرو، میرا ضروری کام چل رہا ہے۔" مہوش نے قدرے بے رُخی سے کہا۔

"فیسبک اور انسٹا گرام تم بعد میں بھی یوز کر سکتی ہو۔" سارہ کو کچھ غصہ آ رہا تھا۔

"میں نہیں آ رہی۔" مہوش نے بھی غصہ دکھایا۔

"شرم کرو کچھ، اللہ ہدایت دے تمہیں۔" سارہ بولی۔

"تم کس کام کی ہو؟ تم کر لو۔" مہوش نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

"ہر کوئی اپنے اعمال بناتا اور بگاڑتا ہے۔" یہ کہہ کر سارہ چلی آئی۔

"کیا ہوا؟ کہاں ہے مہوش؟" امی نے سارہ سے پوچھا۔

"امی وہ کچھ کام کر رہی ہے۔" سارہ بولی۔

"ماں سے بڑھ کر کیسا کام! دوبارہ جاؤ اس کے پاس۔" امی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

سارہ دوبارہ گئی لیکن مہوش پھر بھی نہ آئی۔ اب سارہ امی کے پاس جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی، اگر امی نے پوچھا تو کیا جواب دوں۔

"نہیں آئی؟" امی کا اصرار بڑھا۔

"نہیں امی!" سارہ کا جواب۔

اس کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر انھوں نے کہا: "اب سمجھ آ رہا ہے، دین کیا سکھاتا ہے اور دنیا کیا سکھاتی ہے!" جو اللہ کا نہ بن سکا، وہ پھر والدین کا بھی نہ بن سکے گا، کیوں کہ خوشیوں میں تو غیر بھی ساتھ ہوتے ہیں، بات تو تب بنتی ہے جب ضرورت کے وقت کام آیا جائے۔

"امی! مہوش کے لیے ہدایت کی دعا کر دیں، آپ امی ہیں ہماری، آپ کی دعا ضائع نہیں جائے گی۔" سارہ نے امی سے کہا۔

"ہاں بیٹا!" والدہ نے اتنے دنوں بعد شفقت سے بات کی اور سر پہ ہاتھ رکھا، جس کی وجہ سے سارہ پُرانی سب تلخیاں بھول گئی۔

سبق: والدین کا کوئی ایسا حکم جو شریعت کے خلاف ہو، وہ آپ مان تو نہیں سکتے، البتہ ان کے ساتھ حُسنِ سلوک قائم رکھیں۔ وقت بدلے گا، آپ اپنے اخلاق نہ گرائیں اور والدین کے لیے ہمیشہ دعا گو رہیں۔

بقیہ

مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

کہا، بس آرام سے اس کے کان میں اپنا ایک شاندار منصوبہ سنایا۔

علی احمد سب سُن کر حیرت سے اپیا کو دیکھنے لگا۔ منصوبے کے پہلے مرحلے میں دونوں بہن بھائی قریبی مارکیٹ میں گئے، جب آئے تو ان کے ہاتھ میں تین چار چیزیں تھیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اپیا نے علی احمد کو اشارہ کیا، وہ بھاگ کر اپنا دھلا ہوا پچھلے سال کا ایک سوٹ لایا جو ماپ میں عابد کے پورا تھا۔

اپنے چھوٹے جوڑے اور پالش کی ڈبیہ جو مارکیٹ سے ابھی خریدی گئی تھی، عابد کو یہ کہہ کر پکڑائی کہ "یہ تمہارے جوتے ہیں اور یہ پالش بھی تمہاری ہے۔ اپنے جوتے اس سے پالش کرو اور ڈبیہ باہر گیراج میں بنی الماری میں رکھ دو۔"

"صغریٰ کو آواز دی اور کہا سب کام چھوڑ کر اپنے بیٹے کو باہر لان کے ساتھ تم لوگوں کے استعمال کے لیے جو غسل خانہ بنا ہوا ہے، اس میں اسے خوب رگڑ رگڑ کر نہلاؤ۔"

یہ کہہ کر اپیا نے خریدے گئے سامان میں سے نہانے کا صابن اور شیمپو پکڑایا اور کہا: "اب یہ دونوں چیزیں تمہاری ہیں، وہیں ریک میں رکھ دینا۔"

ابھی صغریٰ حیرت میں تھی کہ یک دم علی احمد سر پر ہاتھ مار کر بولا: "اپیا اپیا! آپ نے سب سے ضروری چیز تو دی ہی نہیں، جو ہم نے سب سے پہلے خریدی تھی۔ ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ!"

"اوہ بھول گئی۔" کہتے ہوئے انھوں نے دونوں چیزیں بھی صغریٰ کو تھمائیں اور تاکید کی یہ برش اب روزانہ عابد صبح اٹھتے ہی کیا کرے گا۔

ماں بیٹا دونوں باہر لان والے غسل خانے کی جانب گئے تو علی احمد اور اپیا دونوں کام میں مگن ہو گئے۔ بس ان کے خریدے ہوئے سامان میں ایک چیز باقی تھی، جس کو دیکھ کر علی احمد کی آنکھوں میں چمک آ رہی تھی۔

پورے چالیس منٹ کے بعد دونوں ماں بیٹا گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے تو علی احمد کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کئی سیکنڈ وہ گم صم عابد کی طرف دیکھتا رہا، پھر بے اختیار بولا: "ارے یہ تم ہو عابد؟ میں نے پہچانا ہی نہیں۔ تم تو بہت پیارے لگ رہے ہو۔ نیا سوٹ، پالش کیا گیا جوتا، صاف دھلا چہرہ شیمپو کیے بال اور سب سے بڑھ کر چمکتے دانت!" علی احمد خوشی سے اسے دیکھ رہا تھا اور عابد اتنا ہی شرما رہا تھا۔ سارے گھر میں ہلچل مچ گئی۔

"ارے عابد! واہ عابد! ہائیں یہ عابد ہے۔۔۔ جیسے فقرے سن کر وہ بہت شرما رہا تھا۔"

منصوبے کا آخری مرحلہ باقی تھا، جب اپیا نے سامان میں سے حروفِ تہجی کی پہچان والا قاعدہ نکالا اور عابد کے حوالے کیا اور بولی: آج سے تم علی احمد کے شاگرد ہو۔ یہ تمہیں حروفِ تہجی اور گنتی کی پہچان کروائے گا، جب یہ موسمِ گرما کی چھٹیوں کے ہوم ورک کے لیے بیٹھے گا تو تم نے بغیر کہے اس کے پاس آ کر سبق یاد کرنا اور سنانا ہے۔ سہ پہر میں جب اسے پڑھانے کے لیے قاری صاحب آئیں گے تو یہ تمہارا نورانی قاعدہ ہے، یہ تم بھی ساتھ ہی پڑھو گے۔۔۔ اور ہاں! ہر دس دن کے بعد تم دونوں کا امتحان میں لیا کروں گی اور اچھے نمبروں پر میری طرف سے انعام بھی ملے گا۔

"ٹھیک ہے نا!" اپیا نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جی مس۔" علی احمد نے شرارتی انداز میں جواب دیا۔

"جی مس جی!" عابد کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

اس کے دھلے چہرے پر اب شرم کے ساتھ خوشی بھی نظر آ رہی تھی۔

اپیا کا منصوبہ سو فیصد کام یاب ہونے جا رہا تھا۔

بچے کو توجہ اور صحیح راستے پر چلانے کی ضرورت تھی اور وہ ضرورت پوری ہونے جا رہی تھی۔

اپیا کو بھی شاید سمجھ میں نہ آتا، اگر چار سال انھوں نے نفسیات جیسے مضمون میں پڑھنے کے بعد ٹاپ نہ کیا ہوتا۔۔۔!!

بیت السلام موبائل ایپ

Available on the App Store

GET IT ON Google Play

- قبلہ ڈائرکشن
- ان فلائٹ نماز ٹائمنگ
- آن لائن ڈونیشن
- زکوۃ کیلکولیٹر
- لائیو اور ریکارڈ بیانات
- روزمرہ کی دعائیں
- قرآن کریم
- نماز ٹائمنگ

اللہ سے رشتہ

ام محمد عبداللہ

"بابا جانی چھت پر بلا رہے ہیں، جلدی آؤ۔۔۔" کرن نے چمن میں کھیلتے بہن بھائیوں کو آواز دی اور خود تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں سب ہی چھت پر موجود تھے۔ بابا جانی نے بچوں کے ساتھ مل کر پاکستانی پرچم لہرایا۔

"کل ہمارا یومِ آزادی ہے۔" بابا جانی نے بچوں کو بتایا۔

"بابا جانی! میں نے ایک ترانہ یاد کیا ہے۔ سناؤں؟" کاشف نے جوش سے پوچھا تو بابا جانی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

کاشف جوشیلے انداز میں سنانے لگا۔

پاکستان کا مطلب کیا؟۔۔۔۔لا الہ الا اللہ

شب ظلمت میں گزاری ہے — اُٹھ وقتِ بیداری ہے
جنگِ شجاعت جاری ہے — آتش و آہن سے لڑ جا

پاکستان کا مطلب کیا؟۔۔۔۔لا الہ الا اللہ

چھوڑ تعلق داری چھوڑ — اُٹھ محمود بتوں کو توڑ
جاگ اللہ سے رشتہ جوڑ — غیر اللہ کا نام مٹا

پاکستان کا مطلب کیا؟۔۔۔۔لا الہ الا اللہ

جرأت کی تصویر ہے تو — ہمت عالمگیر ہے تو
دنیا کی تقدیر ہے تو — آپ اپنی تقدیر بنا

پاکستان کا مطلب کیا؟۔۔۔۔لا الہ الا اللہ

پنجابی ہو یا افغان — مل جانا شرطِ ایمان
ایک ہی جسم ہے، ایک ہی جان — ایک رسول اور ایک خدا

پاکستان کا مطلب کیا؟۔۔۔۔لا الہ الا اللہ

تجھ میں ہے خالد کا لہو — تجھ میں ہے طارق کی نمو
شیر کے بیٹے شیر ہے تو — شیر بن اور میدان میں آ

پاکستان کا مطلب کیا؟۔۔۔۔لا الہ الا اللہ

مذہب ہو تہذیب کہ فن — تیرا جداگانہ ہے چلن
اپنا وطن ہے اپنا وطن — غیر کی باتوں میں مت آ

پاکستان کا مطلب کیا؟۔۔۔۔لا الہ الا اللہ

"ماشاء اللہ۔۔۔ترانہ تو بہت اچھا یاد کیا ہے میرے بیٹے نے!" امی جان جو ابھی ابھی سب کے لیے چائے لے کر اوپر آئی تھیں، انھوں نے کاشف کو ترانہ یاد کرنے پر شاباش دی۔

وہ سب چھت پر پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا میں سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔

"یہ ترانہ سن کر تو مجھے لا الہ الا اللہ سے متعلق ایک حدیث یاد آ رہی ہے۔" سائرہ نے کہا۔

"جی سنائیے!" بابا جانی نے سائرہ کی حوصلہ افزائی کی۔

"آپ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بہتر بات جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے کہی ہے، وہ یہ ہے ایک اللہ کے سوا کوئی اور معبودِ برحق نہیں ہے اور نہ اللہ کا کوئی اور شریک ہے، اسی کی بادشاہت ہے، ساری بڑائی اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔"

"ماشاء اللہ۔۔۔" بابا جانی سائرہ کے حدیث سنانے پر خوش ہوئے۔

"لیکن بابا جانی! یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ پاکستان کا مطلب لا الہ الا اللہ کیسے ہو گیا؟" سلمان نے پوچھا تو بابا جانی مسکرا دیے۔

"اچھا بچو! سلمان کے سوال کا جواب دینے سے پہلے جو حدیث سائرہ نے سنائی ہے، اس میں یہ بات سمجھیں کہ لا الہ الا اللہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔" بابا جانی نے بچوں کو سمجھانا شروع کیا تو وہ غور سے سننے لگے۔

"اس کلمہ کی اہمیت خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے اپنی قوم کے سامنے یوں بیان فرمائی۔

"جو پیغام میں تم تک لایا ہوں، اسے اگر تم قبول کر لو تو اس میں تمہاری دنیا کی بہتری بھی ہے اور آخرت کی بھلائی بھی۔" پھر ایک اور موقع پر فرمایا:

"بس یہ ایک کلمہ ہے، اسے اگر مجھ سے قبول کر لو تو اس کے ذریعے تم سارے عرب کو زیرِ نگین کر لو گے اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا۔"

"لیکن۔۔۔ بابا جانی! یہ کلمہ تو ایک چھوٹا سا جملہ ہی ہے۔۔۔" کرن کو بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"اچھا، اس چھوٹے سے جملے کا مطلب تو بتائیے!" بابا جانی نے کرن سے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے اللہ پاک کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔" کرن نے جھٹ ترجمہ سنایا۔

"اللہ معبودِ برحق ہے، یعنی صرف اللہ ہی کی ذات عبادت کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی تمام جہان کا مالک و حاکم ہے۔ تمام چیزیں اس کی محتاج اور اس سے مدد مانگنے پر مجبور ہیں۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہی ہماری عقل اس کی قدرت اور طاقت کا اندازہ لگا سکتی ہے، جس کو یہ بات سمجھ آ جاتی ہے، اس میں کچھ خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے انکار کرنے والوں اور شرک کرنے والوں میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ جیسے لا الہ الا اللہ کا اعتقاد انسان کے اندر تمام مخلوقات کے لیے محبت کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ یہ کائنات اس کے لیے خدائے واحد کا تخلیق کردہ ایک کنبہ ہے، جس کا وہ خود ایک حصہ ہے اور باقی سب کے ساتھ اسے اپنائیت سے رہنا ہے۔ یہ کلمہ انسان میں خودی کو بیدار کرتا ہے۔ انسان جان لیتا ہے کہ نفع و نقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، پس وہ اللہ کے سوا کسی کے بھی آگے جھکنے سے بچ جاتا ہے۔ خودی کے ساتھ ساتھ لا الہ الا اللہ پر ایمان انسان میں انکساری پیدا کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے عطا کردہ تمام نعمتیں اس کی اپنی نہیں، بلکہ اللہ کی دی ہوئی ہیں اور یہ سوچ غرور کو ختم دیتی ہے۔ اس کلمے کو ماننے والا جانتا ہے کہ نیک عمل کے سوا نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لیے وہ نیکیاں کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، پھر اسی طرح ایک زبردست خدا کو ماننے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا، وہ جانتا ہے کہ مشکل حالات کو اس کا اللہ آسان کر سکتا ہے۔ پس وہ پُر اُمید رہتے ہوئے اپنی کوشش جاری رکھتا ہے۔

کلمہ پر ایمان رکھنے والا انسان بہادر ہوتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کے ساتھ طاقت والا اللہ

ہے۔اسی یقین پر وہ بڑی سے بڑی طاقت اور مشکل کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔اس کلمے پر ایمان رکھنے والا انسان اللہ کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے۔سب سے بڑھ کر لاالٰہ الااللہ پر ایمان انسان کو اللہ کے قانون کا پابند بناتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اللہ البصیر ہے، وہ اسے دیکھ رہا ہے، اس لیے لوگوں میں تو کیا، اکیلے میں بھی لاالٰہ الااللہ کا اقرار کرنے والا برائی کے قریب نہیں جاتا۔"

بچے بابا جانی کو غور سے سن رہے تھے۔

بابا جانی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے: پھر تاریخ بھی ہمیں بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے یہ کلمہ قبول کیا، ان کی شخصیت میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ان تبدیلیوں کے اثرات پھر معاشرے پر مرتب ہوئے اور آپ نے ایک ایسا نظام مدینہ منوّرہ میں قائم کر کے دکھایا، جس کی نظیر نہیں ملتی۔

کیا آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے اس وقت یہ کلمہ قبول کیا ان میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

"بابا جانی! اس وقت لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔شرم و حیا کا کوئی خاص تصور نہیں تھا۔شراب نوشی عام تھی۔چوری، قتل و غارت گری اور سود عام تھا۔حقوق و فرائض متعین نہیں تھے۔غرض بے شمار برائیاں تھیں، جن کی بدولت انسان کی عزّت، مال اور جان اپنے ہی جیسے انسانوں سے محفوظ نہیں تھی، پھر جن لوگوں نے آپ ﷺ سے یہ کلمہ قبول کیا، انھوں نے ایک اللہ کی غلامی قبول کرتے ہوئے ہر برائی چھوڑ دی اور نیکی کا راستہ اختیار کیا اور نہ صرف اختیار کیا بلکہ ہر طرح کے مشکل حالات میں اس پر جمے بھی رہے۔" سائرہ جو جماعت نہم کی طالبہ تھی، نے جواب دیا۔

"جب کلمہ لاالٰہ الااللہ قبول کرنے پر افراد کے کردار میں تبدیلی آئی تو کیا معاشرہ بھی کچھ تبدیل ہوا؟" بابا جانی نے بچوں سے اگلا سوال کیا۔

"جی ہاں بابا جانی! میں نے بچوں کے لیے لکھی گئی سیرت کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ "کلمہ توحید قبول کرنے پر افراد کے اندر واقع ہونے والی تبدیلی کے اثرات معاشرے میں بھی نظر آئے۔ حضور ﷺ نے اسلامی ریاست کی بنیاد جب مدینہ میں رکھی تو زیادہ سے زیادہ وہ علاقہ 100 مربع میل ہوگا۔آٹھ نو سال کے مختصر عرصے میں یہ ریاست پھیل کر 10، 12 لاکھ مربع میل تک وسیع ہوگئی، جس میں کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر فضیلت حاصل نہ تھی، سب بھائی بھائی تھے۔جرائم نہ ہونے کے برابر تھے۔لوگ ایک دوسرے پر ظلم کرنے والے، سرکاری مال اور فرائض میں خیانت کرنے والے اور رشوتیں سمیٹنے والے نہ تھے۔ہر کوئی دوسرے کے کام آتا تھا اور اپنے بھائی کو سہارا دیتا تھا۔یہ ریاست اپنی حفاظت کرنا بھی خوب جانتی تھی۔اس ریاست کے خلاف سازشیں کرنے والوں اور جنگی طاقت اکٹھی کرنے والوں کو بھی ہمیشہ منہ توڑ جواب دیا گیا۔دراصل یہ حقیقی معنوں میں ایک فلاحی معاشرہ تھا، جس کی مثال دنیا نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔" سلمان جو بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، نے جواب دیا۔

شاباش۔۔۔۔سلمان بیٹے! آپ نے بالکل ٹھیک بتایا۔

اب آتے ہیں سلمان کے سوال کی جانب کہ پاکستان کا مطلب لاالٰہ الااللہ کیسے ہے؟

بابا جانی بچوں کو سمجھانے لگے:

حدیث کی رو سے انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی اسی لاالٰہ الااللہ کے ساتھ جڑی ہے۔

اب اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس میں ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ نعرہ بلند کیا۔وہ انگریزوں کے غلام تھے اور ان کے بنائے قوانین پر عمل کرنے کے پابند بھی! انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ جانے کے بعد حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں جانی تھی اور مسلمان ان کے غلام بن کر رہنے پر مجبور تھے۔وہ زبانی کلامی تو لاالٰہ الااللہ کا ورد شاید کر سکتے تھے۔گھروں میں بیٹھ کر کچھ عبادات بھی ہو سکتی تھیں، لیکن لاالٰہ الااللہ اپنے ماننے والوں سے جس نظام کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے وہ ناممکن تھا۔اسلامی معاشرتی مساوات قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ظالمانہ سودی نظام کا خاتمہ ناممکن تھا، اسی طرح اسلام کو بطورِ دین ہر شعبہ ہائے زندگی میں نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تو مسلمانوں کو لگا کہ ان کا اپنا آزاد خود مختار وطن ہونا چاہیے، جہاں وہ لاالٰہ الااللہ کا نظام قائم کریں۔دنیا کو اسلامی فلاحی ریاست ایک بار پھر قائم کر کے دکھا دیں۔

بابا جانی کچھ دیر کے لیے رُکے تو کرن بولی۔

جی بابا جانی! قائدِ اعظم کا فرمان بھی ہے نا کہ "ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا، بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔"

"جی بالکل! تو پاکستان کا مطلب کیا لاالٰہ الااللہ کا مطلب ہے کہ پاکستان میں فرد اور معاشرہ لاالٰہ الا اللہ سے محبت کرنے والے اور اسے بطورِ نظام قائم کرنے والے ہوں گے۔"

بابا جانی خاموش ہوئے تو بچے بھی چپ چاپ بیٹھ گئے۔سب ہوا کے دوش پر لہراتے سبز ہلالی پرچم کو دیکھ رہے تھے۔

"بابا جانی! تو کیا اب پاکستان نے دنیا کو دکھا دیا ہے کہ لاالٰہ الااللہ پر قائم ریاست کتنی اچھی ہوتی ہے؟" کاشف جو بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، نے معصومیت سے پوچھا۔

کاشف کے سوال پر بابا جانی دکھ سے بولے: "نہیں! ابھی تک تو ہم یہ نظام قائم نہیں کر پائے۔"

سلمان اور سائرہ جوان باتوں کو سمجھ رہے تھے، پریشان ہو گئے۔

"بابا جانی! 77 سال کی مدّت میں ہم" پاکستان کا مطلب کیا؟" عملی طور پر پورا کر کے نہیں دکھا پائے، یہ تو بہت مایوسی والی بات ہے۔" سلمان بولا۔

"نہیں بیٹا! لاالٰہ الااللہ سے ہم نے یہ ہی تو سیکھا ہے کہ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔بس ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ لاالٰہ الااللہ کے نام پر بیش بہا قربانیاں دے کر حاصل کیے گئے اس وطن کی تعمیر میں ہم اپنا حصہ کیسے ڈالیں؟" امی جان نے بھی پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

سب سے پہلے تو اس حدیثِ رسول ﷺ پر اپنا ایمان پختہ کریں۔

"جو پیغام میں تم تک لایا ہوں، اسے اگر تم قبول کر لو تو اس میں تمہاری دنیا کی بہتری بھی ہے اور آخرت کی بھلائی بھی۔" پھر ایک اور موقع پر فرمایا:

"بس یہ ایک کلمہ ہے، اسے اگر مجھ سے قبول کر لو تو اس کے ذریعے تم سارے عرب کو زیرِ نگین کر لو گے اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا۔"

بابا جانی نے کہا تو امی جان بولیں: "جی بالکل! لاالٰہ الااللہ کو اپنی زندگیوں میں زبانی ہی نہیں، عملاً بھی شامل کریں۔"

"مگر کیسے؟" کرن نے سوال کیا۔

"اللہ تعالیٰ کے احکامات کو سمجھنا، سچے دل سے ان پر عمل کرنا، دوسروں کو محبت و حکمت سے اس کی تعلیم دینا اور اسلامی تعلیمات کو اجتماعی سطح پر نافذ کرنے کی مخلصانہ کوششیں کر کے ہم پاکستان کو لاالٰہ الااللہ کی تفسیر بنا سکتے ہیں۔" بابا جانی نے سمجھایا۔

"کاشف بیٹے! آپ کو بھی کچھ سمجھ آیا کہ نہیں؟" امی جان نے شرارتی کاشف سے پیار سے پوچھا۔

"آپ مشکل مشکل کر کے بتا رہے ہیں، جبکہ جو ترانہ میں نے آپ کو سنایا تھا، اس میں تھا نا

جاگ اللہ سے رشتہ جوڑ — بس یہ ہی بات ہے ساری!
چھوڑ تعلق داری چھوڑ — اُٹھ محمود بتوں کو توڑ
جاگ اللہ سے رشتہ جوڑ — غیر اللہ کا نام مٹا

پاکستان کا مطلب کیا؟۔۔۔۔لاالٰہ الااللہ

کاشف نے ایک بار پھر جوش و خروش سے ترانہ پڑھنا شروع کیا تو سب ہی مسکراتے ہوئے پاکستان کو لاالٰہ الااللہ کی تفسیر بنانے کا عزم کرنے لگے۔

نجات کی کشتی

ڈاکٹر الماس روحی

حضرت نوح علیہ السّلام اللہ پاک کے بہت پیارے نبی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السّلام کے ایک ہزار سال بعد آپ پیدا ہوئے۔ آپ نیک صفت اور بہت پیارے انسان تھے، کوئی عبدالغفار کہتا ہے، کوئی عبدالجبار پکارتا ہے، آپ کو لوگ الیاس بھی کہتے ہیں اور کوئی کشتی والا نبی کہتا ہے۔ آپ حضرت ادریس علیہ السّلام کے پڑپوتے ہیں۔ آپ نے لمبی عمر پائی۔ آپ کا قرآنِ پاک میں کئی مقامات پر ذکر ہے، آپ کے نام سورۂ نوح بھی ہے۔ حضرت نوح علیہ السّلام کی قوم کے لوگ نسلی برتری کا شکار تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس دور میں ہر قسم کی پوجا پاٹ ہوتی تھی۔ اللہ پاک کے حکم سے جب آپ نے توحید کا پیغام دیا تو ان کی قوم اور بھی باغی ہو گئی، طرح طرح سے لوگ آپ کو اذیتیں دینے لگے۔ آپ پھر بھی سمجھاتے "اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، تمہارے مال میں برکت ہو گی اولاد بھی زیادہ ہو گی اور قحط سالی بھی ختم ہو جائے گی، بارشیں خوب برسیں گی۔ تمہارے باغات میں خوب میوے لگیں گے۔ اپنے رب پر یقین رکھو، خدا کا شکر کرو، دیکھو! اللہ پاک نے ہم انسانوں کے لیے زمین، آسمان، سورج، چاند تارے بنائے۔ ہمیں اللہ پاک کی عبادت کرنی چاہیے۔" حضرت نوح علیہ السّلام کی قوم نے ان پر پتھر برسائے۔ اُن کا گلہ دبایا اور انھیں مردہ خیال کر کے چادر میں لپیٹ دیا، ان کے بڑے اپنے چھوٹوں کو نصیحت کرتے۔ خبردار! نوح (علیہ السّلام) کی بات نہ ماننا اور اپنے باپ دادوں کا طریقہ نہ چھوڑنا، یہ بندہ دیوانہ ہے۔ ہماری عمریں گزر گئی ہیں یہ جھوٹ بولتا ہے۔ کوئی عذابِ الٰہی نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السّلام کی حقارت کے درپے ان کے پیچھے چھوٹے سرکش بچوں کو بھیج دیا جاتا، تاکہ وہ ان پر ہنسی مذاق کریں اور پتھر برسائیں۔ یہ بچے حضرت نوح علیہ السّلام کو اس قدر مارتے کہ آپ کا بدن مبارک لہولہان ہو جاتا، بہتے ہوئے خون کے ساتھ پھر بھی حضرت نوح علیہ السّلام دعا کرتے: "یارب! میری قوم کو بخش دے، یہ جاہل اور نادان ہیں۔" حضرت نوح علیہ السّلام کی قوم کے بڑے، بڑے امیر اور مغرور سرداران سے کہتے: "تمہارے تابع داروں میں کوئی مال دار نہیں، جو ہم میں غریب، حقیر اور ذلیل ہیں، وہ تابع دار ہیں۔" حضرت نوح علیہ السّلام ان کی ایسی باتوں کا یوں جواب دیتے: "میں تم سے مال و دولت طلب نہیں کرتا، میری مزدوری اللہ کی جانب سے مجھے ملے گی، جو لوگ میری باتوں پر ایمان لائے، وہ تمہاری نظر میں ذلیل ہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کہ انھیں اپنے پاس سے بھگا دوں۔ اگر ایسا کروں گا تو ظالموں میں شمار ہو جاؤں گا۔" حضرت نوح علیہ السّلام نے ساڑھے نو سو سال تک اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ اتنے بڑے عرصے کے باوجود صرف اسّی 80 آدمی ایمان لائے۔ حضرت نوح علیہ السّلام اپنی قوم سے بالکل ناامید رہنے لگے۔ وہ سخت ملول اور پریشان ہوتے اور بددعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے: "اے میرے پروردگار! اس زمین پر کسی کافر کے رہنے کی جگہ نہ چھوڑ، اگر تو ان کو زندہ چھوڑ دے گا یہ تیرے بندوں کو گم راہ کر لیں گے۔" اور پھر اہلِ ایمان کے لیے یوں دعا کرتے: "اے میرے پیارے رب! مجھ کو، میرے ماں باپ کو بخش دے اور جو مومن مرد اور عورت میرے گھر میں داخل ہوں، ان کو بخش دے اور اپنی رحمت کے سائے میں رکھ۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السّلام کی دعا قبول کی اور حضرت نوح علیہ السّلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے سب سے پہلے ایک درخت کے بیج زرخیز زمین میں بو دیے، جو سو سال سے بڑھتے رہے، ان درختوں کو کاٹ کر تختے بنائے، پھر کشتی بنانی شروع کی۔ نافرمان لوگ حضرت نوح علیہ السّلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ بھلا خشکی میں کشتی کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے علاقے میں دور دور تک پانی نہیں ہے تو کشتی کیسے چلے گی۔ حضرت نوح علیہ السّلام خاموش رہے، کشتی سو سال میں مکمل تیار ہوئی۔ کشتی طویل تھی۔ باہر سے روغن کیا گیا۔ اس کشتی کے تین درجے تھے۔ سب سے نیچے درجے میں چوپائے جنگلی جانور سوار ہوئے۔ درمیانی حصے میں انسان اور اوپر کے حصے میں پرندے تھے۔ کشتی اوپر سے بالکل بند تھی۔ کشتی میں ہر جانور کا جوڑا سوار کیا گیا۔ نباتات کے بیج بھی کشتی میں رکھے گئے تھے۔ مویشی جب کشتی میں سوار ہو گئے تو لوگوں نے کہا کہ "شیر کی موجودگی میں مویشیوں کو خطرہ ہے۔" اس وقت اللہ کے حکم سے شیر کو بخار ہوا۔ بخار کی وجہ سے وہ بے ہوش پڑا رہا۔ اس سے پہلے زمین پر بخار کی بیماری نہ تھی۔ اس کشتی میں جب چوہا کشتی کے کنارے پر آ کر اس کی لنگر کی رسیوں کو کاٹنے لگا تو حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السّلام کو حکم دیا کہ شیر کی دونوں آنکھوں کے درمیان چوٹ مارو، جس سے ایک بلّا اور بلی نکلے۔ ان دونوں نے چوہے پر حملہ کر کے اسے لنگر کی رسی کاٹنے سے باز رکھا۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے اپنی قوم کو حکم دیا تھا کہ "لوگو! کشتی پر سوار ہو جاؤ۔ اس کشتی کا تیرنا خدا کے نام کی برکت سے ہے اور ٹھہرنا بھی اسی کے نام کی برکت سے! بے شک میرا اللہ بخشش کرنے والا اور مہربان ہے۔" کشتی پانی کی لہروں پر پہاڑ کی مانند تیر رہی تھی۔ ایک پہاڑ پر حضرت نوح علیہ السّلام کا بیٹا کنعان کھڑا تھا۔ آپ نے اسے پکارا: "اے میرے بیٹے! اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، کافروں کا ساتھ چھوڑ دے۔" کنعان بن نوح نے جواب دیا: "ہرگز نہیں، میں پہاڑوں کی پناہ میں ہوں، یہ مجھے بچا لیں گے، اچانک دونوں کے درمیان موج حائل ہوئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السّلام بیٹے کو بہتا دیکھ کر رونے لگے اور اپنے رب سے فریاد کی: "اے میرے پروردگار! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے تھا، تیرا وعدہ سچا ہے تو تمام حاکموں سے بہتر ہے۔" پروردگار نے اس موقع

● بقیہ صفحہ نمبر 38 پر

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ

بنتِ تاجور

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیدائش سن 598 میں مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ حسب و نسب کے اعتبار سے قبیلۂ بنو مخزوم کے سردار تھے۔ عزّت و وقار کی نگاہ سے دیکھے جانے والے آتش جوان، جری جرنیل، مال و دولت کے اعتبار سے قابلِ رشک زندگی بسر کرنے والے سردار تھے۔ پیشے کے اعتبار سے آپ عسکری قائد (ملٹری لیڈر) تھے۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تیر و تُفنگ (بندوق، کارتوس) کے ماہر تھے۔ تیز رفتار اتنے کہ منہ زور گھوڑا بھی ان کی گردِ پا کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرات گرامی سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہم جولی (جو ساتھ مل کر کھیل کر بڑے ہوئے ہوں) تھے۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے 8 ہجری فتحِ مکہ کے بعد اسلام قبول کیا۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام عکرمہ بن ابی جہل بن ہشام بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم القرشی المخزومی ہے اور لقب 'الراکب المہاجر' تھا۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا باپ پکا کافر، کفارِ مکہ کا سرغنہ، دشمنانِ اسلام کا لیڈر اور پیارے نبی ﷺ کو ستانے میں سب سے آگے رہنے والا شخص تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں اسے؟ وہی جاہلوں کا باپ جسے عرفِ عام میں ابو جہل کہا جاتا ہے۔

عکرمہ اسی مشہورِ زمانہ دشمنِ اسلام ابوجہل کے بیٹے ہیں۔ باپ کی طرح انھوں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ غزوۂ بدر میں ان کا باپ جذبۂ شہادت سے مغلوب دو جوشیلے نوجوانوں معاذ اور معوّذ کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ عکرمہ نے اپنے باپ کو خاک وخون میں تڑپتا دیکھ کر اس کے قاتل معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایسا وار کیا کہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بازو کٹ کر لٹک گیا۔ غزوۂ بدر کے بعد جن لوگوں نے بدر میں قتل ہونے والوں کا انتقام لینے کی مہم چلائی، ان میں ایک عکرمہ بھی تھے، چناں چہ غزوۂ اُحد میں خالد بن ولید اور عکرمہ مشرکین کی کمان کر رہے تھے۔

5ھ میں جب تمام مشرکینِ عرب نے اپنے قبیلوں کے ساتھ مدینہ منوّرہ پر چڑھائی کی تو عکرمہ بھی قبیلۂ بنی کنانہ کو لے کر مسلمانوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے گئے۔

جب فتحِ مکہ میں اہلِ مکہ نے بغیر کسی مقابلہ کے سپَر (ہار، شکست) ڈال دی تھی، لیکن بعض تعصب پسند اشخاص جن میں قرابت داری کا لحاظ و خیال، گروہ کی وفاداری اور پاس داری زیادہ تھی، مزاحمت کی۔ ان میں ایک عکرمہ بھی تھے غرض یہ کہ شروع سے آخر تک انھوں نے ہر موقع پر اپنی اسلام دشمنی کا پورا ثبوت دیا۔ یہ چپکے سے یمن چلے گئے، لیکن ان کی بیوی اُمِّ حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے (جو ابو جہل کی بھتیجی تھیں) اسلام قبول کر لیا اور اپنے شوہر عکرمہ کے لیے بارگاہِ نبوی ﷺ میں معافی کی درخواست اور رحم کی اپیل کی۔ رحمۃ اللعالمین ﷺ نے عکرمہ کو معاف فرما دیا۔ اب اللہ والی بی بی اُمِّ حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا خود یمن تشریف لے گئیں اور شوہر کو معافی کا حال بیان کیا۔ عکرمہ حیرت زدہ رہ گئے اور انتہائی تعجب کے ساتھ کہہ اُٹھے: "کیا مجھ جیسے دشمن کو محمد ﷺ نے معاف کر دیا!"

بہر حال! آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی پاک بیوی حضرت اُمِّ حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہم راہ بارگاہِ عزّت مآب میں مسلمان ہو کر حاضر ہوئے۔ پیارے نبی جی ﷺ نے جب عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا تو بے انتہا مسرور ہوئے اور اس تیزی سے عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بڑھے کہ جسمِ اطہر سے چادر گر پڑی، گلے ملتے ہوئے فرمایا:

مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ "اے ہجرت کرنے والے سوار، مرحبا!" حضرت سیدنا عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آقائے کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دستِ مبارک پر خوشی سے بیعت کی۔

قبولِ اسلام کے بعد عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی گزشتہ اسلام دشمنی کی تلافی کی بڑی فکر رہنے لگی تھی، جس کی تلافی میں وہ ہمہ تن لگ گئے۔

لیکن فتحِ مکہ کے بعد آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جہاد کے کم ہی مواقع پیش آئے، اس لیے عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تلافی کا پورا موقع نہ مل سکا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ حکومت میں جب فتنۂ ارتداد اٹھا تو عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیرینہ خواہش پوری کرنے کا سنہری موقع ملا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عکرمہ اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو قبیلۂ ازد کی سرکوبی پر مامور کر کے عمان بھیجا۔ انھوں نے اس کے سردار لقیط بن مالک کو قتل کر کے بنی ازد کو دوبارہ صاحبِ ایمان کیا اور بہت سے قیدی گرفتار کر کے مدینہ لائے۔ ازد کا فتنہ زیر ہونے کے بعد ہی عمان کے دوسرے قبائل میں ارتداد کی وبا پھیل گئی اور وہ سب شہر میں جمع ہوئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پھر عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا تو انھوں نے ان سب کو شکست دی۔ ان سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ بنی مہرہ مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی طرف بڑھے، لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی اور بنی مہرہ نے زکوٰۃ ادا کر دی۔

یمن کے مرتدوں کے مقابلہ پر حضرت زیاد بن لبید مامور ہوئے تھے اور انھوں نے بہت سے قبائل کی سرکوبی کر کے انھیں درست کر دیا تھا، لیکن ایک مرتد اشعث بن قیس نے زیاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ کر کے ان سے تمام دھن دولت غلہ وغیرہ جو انھوں نے مرتدین سے حاصل کیا تھا اور تمام مرتد قیدی بھی چھین لیے۔ سیدنا زیاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی اطلاع کی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا۔ انھوں نے زیاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مہاجرین ابی امیہ کے ساتھ مل کر اشعث کے سینکڑوں پیروکاروں کو تلوار سے کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اشعث بچ گیا، اس کو مجبور ہو کر اپنے قبیلہ کے لیے امان طلب کرنی پڑی۔

فتنۂ ارتداد کا سر کچلنے کے بعد شام کی فوج کشی میں مجاہدانہ شریک ہوئے اور تادمِ آخر نہایت جاں فروشی سے لڑتے رہے۔

"جہادِ فحل" میں اس بہادری اور شجاعت سے لڑے کہ بے دھڑک، بلا خوف و خطر دشمنوں کی صفوں میں گھستے چلے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ دشمن سے لڑتے، انھیں مارتے ہوئے صفوں کے اندر گھس گئے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر اور سینہ زخموں سے چھلنی ہو گیا۔

لوگوں نے کہا: "عکرمہ! اللہ سے ڈرو، اس طرح اپنے کو ہلاک نہ کرو، ذرا نرمی سے کام لو۔"

جواب دیا: "میں لات و عزیٰ کے لیے تو جان پر کھیلا کرتا تھا اور آج اللہ اور رسول کے لیے جان بچاؤں! اللہ کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

جہادِ شام کی تمام جنگوں میں جنگِ یرموک نہایت اہم شمار کی جاتی ہے، اس جہاد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک دستے کا افسر بنایا تھا۔ عکرمہ رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے افسری کا پورا حق ادا کیا۔ دورانِ جہاد ایک مرتبہ رومیوں کا حملہ اتنا زبردست ہوا کہ مسلمانوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ایسے نازک لمحات میں شیرِ خدا حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دہاڑتے ہوئے کہا کہ "ہم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ کتنی لڑائیاں لڑ چکے ہیں اور آج تمہارے مقابلے میں بھاگ نکلیں گے؟"

ساتھ ایک زوردار آواز دی کہ "تم میں سے کون ہے جو موت پر بیعت کرتا ہے؟" ان کی آواز پر چار سو مسلمان ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان دینے کے لیے دل و جاں سے آمادہ ہو گئے۔ ان جاں نثاروں کو لے کر عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خیمہ کے سامنے اس پامردی سے لڑے کہ چار سو آدمیوں میں سے کئی جانبازوں نے جامِ شہادت نوش کیا، جو زندہ بچ گئے وہ شدید زخمی تھے۔ انہی زخموں سے چور غازیوں میں عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے دو لختِ جگر بھی شامل تھے۔ بیٹوں کی حالت زیادہ نازک تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ انھیں دیکھنے کے لیے آئے اور ان کے سروں کو زانو پر رکھ کر سہلاتے جاتے تھے اور حلق میں پانی ٹپکاتے جاتے تھے۔

مشرّف بااسلام ہونے کے بعد عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیارے آقا ﷺ سے کہا تھا کہ "اب تک جتنی لڑائیاں میں راہِ خدا کی مخالفت میں لڑ چکا ہوں، اس سے دُگنی اس کی راہ میں لڑوں گا اور جتنی دولت اس کی مخالفت میں صرف کر چکا ہوں اس کی دُگنی اس کی راہ میں صَرف کروں گا۔

اس عہد کو انھوں نے فتنۂ ارتداد اور شام کی معرکہ آرائیوں میں پورا کیا اور ان کے مصارف (خرچ) کے لیے ایک جبہ (مردانہ پوشاک) بھی بیت المال سے نہیں لیا۔ جب شام پر حملہ آوری کے انتظامات ہونے لگے اور خلیفۂ اوّل ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ معاینہ کرنے کے لیے تشریف لائے تو معاینہ کرتے ہوئے ایک خیمہ کے پاس پہنچے، اس کے چاروں طرف گھوڑے، نیزے اور سامانِ جنگ نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو خیمہ میں سیدنا عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دکھائی دیے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سلام کیا اور اخراجاتِ جنگ کے لیے کچھ رقم دینی چاہی۔ عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: "مجھ کو اس کی حاجت نہیں ہے، میرے پاس دو ہزار دینار موجود ہیں۔"

یہ سُن کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے دعائے خیر کی۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بارے میں کئی قول ملتے ہیں۔ زیادہ صحیح یہ معلوم ہے کہ ان کی شہادت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ حکومت میں جنگِ یرموک میں ہوئی۔

بقیہ

نجات کی کشتی

پر فرمایا: "اے نوح! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں تھا، اس کے کام اچھے نہیں تھے، تجھے اس کا علم نہیں۔" حضرت نوح علیہ السّلام نے اللہ پاک کی پناہ مانگی اور بھلائی کا سوال کیا۔ کشتی سمندر کی موجوں پر تیرتی ہوئی اللہ کے حکم سے مڑی اور چالیس دن تک بیت اللہ شریف کا طواف کرتی، پھر اللہ نے زمین و آسمان کو حکم کیا: "اے زمین! تو اپنا پانی نگل لے اور آسمان بس کر، تھم جا!" اللہ نے ہوا ایسی چلائی کہ زمین خشک ہو گئی اور کشتی جودی پہاڑ پر جا لگی۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے کوے کو خشکی کی خبر لانے کو کہا تو کو امردار گوشت کھاتا رہا، اسے دیر ہو گئی، وہ نہ آیا تو پھر حضرت نوح علیہ السّلام نے کبوتر کو بھیجا، جو زیتون کے درخت کا پتہ لایا اور پاؤں پر بھی مٹی لگی تھی۔ یہ خوش خبری تھی زمین خشک ہو رہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السّلام نے کوے کو ہمیشہ ڈرتے رہنے کی بد دعا دی اور کبوتر کی گردن میں حصرہ کا طوق ڈال دیا۔ وہ امن کے ساتھ رہتا ہے اور یہ نوح علیہ السّلام کی دعا ہے کہ لوگ بڑی اُنس کے ساتھ اسے اپنے گھروں میں رکھتے ہیں، عذابِ الٰہی سے نجات کی کشتی میں لوگ رجب کی دسویں تاریخ کو سوار ہوئے۔ کشتی مشرق و مغرب میں پھرتی رہی محرم کے مہینے میں عشورہ کے دن لوگوں نے روزہ رکھا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ جودی پہاڑ کے نیچے حضرت نوح علیہ السّلام نے بستی بنائی، جس کا نام ثمانین رکھا۔ وہاں ایک دن صبح کے وقت لوگ اُٹھے تو ہر ایک بولی بدلی ہوئی تھی۔ اسّی افراد مختلف اسّی زبانیں بولتے تھے۔ آپ سب کو ان کی اپنی اپنی زبانوں میں دین کی باتیں سمجھایا کرتے۔ اللہ نے سب زبانیں حضرت نوح علیہ السّلام کو سکھا دی تھیں۔

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
برتری	بڑائی	انس	محبت
حقارت	ذلت	سرکش	باغی
ملول	اُداس	عشورہ	محرم کی دس تاریخ
حائل آنا	درمیان میں		

جامن

بنت مسعود احمد

موسم گرمی کا ہے آیا — جامن کا تحفہ ہے لایا
ٹھیلوں پر سجتے ہیں کیسے — کالے کالے ٹیلوں جیسے
کھانے میں اچھے ہیں لگتے — جامن پکے میٹھے میٹھے
جامن کا پھل خون بڑھائے — جامن ہاضم بھی کہلائے
ہے وٹامن سی سے یہ پر — سب ہی کے یہ دل کو بھائے
ابو جب بھی لے کر آئیں — بچے خوشی سے شور مچائیں
دادی بھی یہ شوق سے کھائیں — شوگر ان کی یہ نہ بڑھائیں
مل جل کر تھالی میں کھائیں — رب کی نعمت کے گن گائیں

آزادی ایک نعمت

مہوش اشرف

”دادی اماں! آج آپ کوئی کہانی نہیں سنائیں گی؟“ ارسل نے پیار سے دادی اماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

سناؤں گی، کیوں نہیں سناؤں گی میرے پیارے شہزادے! اور آج تو میں تمھیں ایک بہت ہی معلوماتی کہانی سناؤں گی، جس سے نہ صرف تمھیں برِّصغیر پاک وہند کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوگا، ساتھ میں تمھیں فلسطین پر یہود تسلّط کے بارے میں بھی بتاؤں گی۔

”اس کا مطلب آج آپ مجھے دو دو کہانیاں سنائیں گی۔“ ارسل نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”پیارے بیٹے ارسل! یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ برِّصغیر پاک وہند پر ایک عرصے تک انگریزوں کا تسلّط قائم رہا۔ کہنے کو تو وہ تجارت کی غرض سے برِّصغیر آئے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے یہاں پر اپنا تسلّط قائم کر کے ہندو اور مسلمانوں کو اپنا غلام بنا لیا اور یہاں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ لیکن کیا تم نے جانتے ہو کہ ان کا یہ تسلّط کتنے عرصے قائم رہا اور وہ کب یہاں پر آئے تھے؟ تو میرے پیارے بیٹے! وہ یہاں پر 1757 میں آئے اور تقریباً 200 سال انھوں نے یہاں پر حکومت کی تو یہ جو جدِوجُہدِ آزادی ہے، یہ کوئی ایک دو دن کی محنت کا ثمر نہیں! یہ جدِوجُہدِ آزادی 200 سال کی قربانیوں مشقّت اور محنت کا ثمر ہے کہ مسلمانوں نے قائدِاعظم کی سربراہی میں ایک الگ وطن حاصل کیا۔ اس وطن کے حاصل کرنے میں لاکھوں نہیں کروڑوں لوگوں نے قربانیاں دیں اور انھوں نے بہت ظلم وجبر اور پریشانی سہی۔ یہ آزادی رب العزّت کی ایک خاص نعمت ہے۔ آج ہم آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں، اپنے مذہب پر عمل کرنے میں پوری طرح سے آزاد ہیں۔ آج ہماری مسجدوں سے اذانوں کی صدائیں پانچ وقت بلند ہوتی ہیں اور ہم لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ کے سائے تلے اللہ اور رسول کے احکام کی پابندی کرنے میں آزاد ہیں۔“

”دادی اماں! دو سو سال کا عرصہ تو ایک طویل جدِوجُہد ہے، میں نے تو کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ 1930 میں الٰہ آباد کے مقام پر علامہ اقبالؒ نے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا اور 1940 میں قرارداد منظور ہوئی اور 1947 میں ہمارا وطن ہمیں مل گیا اور انگریز چوں کہ برطانیہ سے آئے تھے، لہٰذا وہ وہاں واپس چلے گئے۔ میں تو قطعی طور پر یہ نہیں جانتا تھا کہ انھوں نے 200 سال تک مسلمانوں کا خون پیا اور ان پر اتنے ظلم اور جبر کیے۔“ دس سالہ ارسل نے نہایت حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”دادی اماں! کیا پاکستان اور فلسطین میں کوئی مماثلت ہے اور کیا انگریزوں کی طرح یہود بھی کسی ملک سے آئے تھے؟ مجھے ذرا اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیے کہ فلسطین کی تاریخ بیت المقدس قبلۂ اوّل کی حیثیت اور حقیقت اور اس کے بارے میں اہم باتیں کہ جو میرے اور میرے ہم عمر بچوں کو معلوم ہونی چاہیں، آپ تو جانتی ہی ہیں کہ آج کل کے بچے کتابیں کم ہی پڑھتے اور وہ زیادہ تر وقت سوشل میڈیا پر ضایع کر رہے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے انھیں نہ صرف اپنی تاریخ کے بارے میں کچھ پتا ہے اور نہ ہی اپنے اسلاف کے بارے میں بہت زیادہ کچھ جانتے ہیں اور ہم میں سے تو اکثر 14 اگست کو آرام کا دن اور شور وغل میں ضایع کر دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم سجدہ کریں، اپنے رب کے حضور اور اس کا شکر ادا کریں اور اپنے وطن کے لیے اور اس کی سلامتی کے لیے دعائیں کریں، ساتھ میں کشمیر اور فلسطین اور برما کے مسلمانوں کے لیے بھی اور دنیا میں جہاں جہاں مسلمان موجود ہیں ان کے لیے بھی۔“ ارسل نے معصومیت سے کہا۔

”میرے پیارے بیٹے! ماشاءاللہ! تم کتنے سمجھ دار ہو، اللہ تعالیٰ تمھیں نظرِبد سے بچائے۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، ہونا تو یہی چاہیے کہ ہم 14 اگست کے دن اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوں اور اپنے وطن کی سلامتی اور اس کی ترقی کے لیے دعا کریں، بجائے اس کے کہ ہم سڑکوں پر نکل کر شور وغل کریں اور لوگوں کی اذیت کا باعث بنیں۔“ دادی اماں نے شفقت فرماتے ہوئے کہا۔

اور جہاں تک بات ہے پاکستان اور فلسطین کے حالات میں مماثلت کی تو جنگِ آزادی سے پہلے کے جو حالات تھے، وہ کچھ اس طرح کے ہیں کہ انگریز تو برطانیہ سے آئے تھے، لیکن یہودیوں کا اپنا کوئی بھی وطن نہ تھا اور دوسری جنگِ آزادی میں ہٹلر نے ان کو قتل کیا۔ یہ ایک بحری بیڑے میں سوار اپنی جان بچا کر بھاگے۔ انھیں کوئی بھی ملک رکھنے کے لیے آمادہ نہ تھا، ایسے میں فلسطین کے مسلمانوں نے انھیں اپنے وطن میں سر چھپانے کے لیے جگہ دی اور یہ احسان فراموش مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اب ان کا اپنا تو کوئی وطن ہے نہیں کہ یہ وہاں واپس چلے جائیں۔ دوسری جانب امریکہ ان کی پشت پناہی کر رہا ہے، جیسے کہ قرآن میں آتا ہے کہ یہود ونصاریٰ کسی کے دوست نہیں ہو سکتے۔ فلسطین انبیا علیہم السّلام کی سرزمین ہے، یہاں کے رہنے والے مسلمان غیور اور حرمت پسند ہیں۔ ہم کٹ مرنے کو تیار ہیں، لیکن اپنی زمین کسی یہود کو ہرگز نہیں دے سکتے اور جب تو بالکل بھی نہیں کہ جب ان کے عزائم قبلۂ اوّل کو ڈھا دینے کے بعد تھرڈ ٹیمپل بنانے کے ہوں۔ بیٹا! اب تم جانتے ہو کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے، لہٰذا اپنی اس آزادی کی ہر قیمت پر حفاظت کرنا اور فلسطین کے مسلمانوں کے لیے بھی دعا کرنا۔ یہ چودہ اگست گزری تمام 14 اگست سے مختلف ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ہمارے وطنِ عزیز کی حفاظت فرمائے اور کشمیر وفلسطین کے مسلمانوں کو جلد از جلد آزادی کی نعمت سے ہم کنار فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔“ دادی اماں نے اپنے بہتے ہوئے آنسو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے اپنی کہانی ختم کی۔

بچوں کے فن پارے

حوریہ فاطمہ 9 سال بارسلونا اسپین

سارہ عمیر 11 سال ، پنجم دار ارقم کراچی

صالحہ رئیس 12 سال راول پنڈی

سدیم صفی، 12 سال اسلام آباد

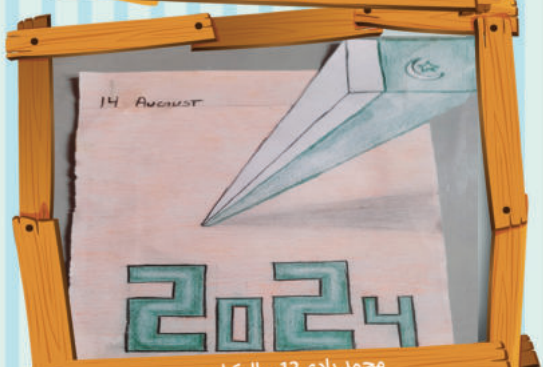

محمد ہادی 12 سال کراچی

کشف اسلم 11 سال لاہور

مومنہ عثمان ، 10 سال سیالکوٹ

منابل رفیق میر پور خاص

ہر ماہ ایک فن پارے پر 300 روپے انعام دیا جاتا ہے گزشتہ ماہ ماہ میر پور خاص سے منابل فاطمہ کا فن پارہ انعامی قرار پایا ہے، انہیں 300 روپے مبارک ہوں (ادارہ)

پیارے بچو!!!

اگست کے مہینے کی 14 تاریخ کو ہم یوم آزادی مناتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی خوشی کا دن ہے لیکن آپ کو اس دن کے ساتھ جڑی تاریخ کا بھی ضرور علم ہونا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ یہ وطن اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ان گنت قربانیاں دے کر بنایا گیا ہے اور اس وطن کو بنانے کا مقصد تب ہی پورا ہو گا، جب ہم اس وطن کو دنیائے عالم میں ایک حقیقی اسلامی ریاست کے طور پر پیش کر سکیں گے تو آج ہی سے اپنی ساری توجہ حصول علم پر مرکوز کریں دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم بھی ضرور سیکھیں تاکہ آپ اس پیارے وطن کی آزادی کی حفاظت بھی کر سکیں اور اس کے قیام کے مقصد کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یوم آزادی بھلے طریقے سے منائیں۔ انار پٹاخے، باجے، بے ہنگم شور شرابہ اور اس طرح کے دیگر کاموں کو آزادی منانے سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ یوم آزادی منانے کے لیے اپنا سب سے اچھا لباس پہنیں، شکرانے کے نوافل ادا کریں، مزے کا کھانا پکا کر غریب بستیوں میں خود تقسیم کرنے جائیں، بغیر موسیقی کے ترانے سنیں اور یاد کریں، تحریک پاکستان کی عظیم شخصیات کے بارے میں جانیں اور پکا عہد کریں کہ اس پیارے وطن کی ترقی و خوشحالی، اس کی آزادی کی حفاظت اور اس میں اسلامی نظام کے نفاذ کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

ماہنامہ فہم دین اگست 2024ء کے سوالات

سوال 1: روغینہ روز کیا کرتی تھی؟

سوال 2: عثمان کے تایا کہاں رہتے تھے؟

سوال 3: فہیم کا مخلص دوست کون تھا؟

سوال 4: حشمت کے معنی کیا ہیں؟

سوال 5: بادشاہ نمرود کون سے ملک کا حاکم تھا؟

جولائی 2024ء کے سوالات کے جوابات

جواب 1:. روبوٹس

جواب 2: دوسری جماعت کی

جواب 3:. ارسطو جونیئر

جواب 4: خوش بو

جواب 5: حضرت علی رضی اللہ عنہ

جولائی 2024ء کے سوالات کا درست جواب دینے پر کراچی سے محمد ہادی کو شاباش انہیں 300 روپے مبارک ہوں

سنیے!!!!

یہ سوالات جولائی 2024 کے شمارے سے لیے گئے۔ جوابات کی آخری تاریخ 15 اگست 2024ء ہے

آزادی ایسے منانی ہے اب

ارسلان اللہ خان

ہم کو آزادی ایسے منانی ہے اب
ہم کو آزادی ایسے منانی ہے اب

اصل میں دوستو ہم نے ٹھانی ہے اب
کہ ہر اک شے ہمیں خود بنانی ہے اب

ہم کو ہونا ہے، اس بار خود انحصار
تا کہ پھر لوٹ آئے ہمارا وقار

بات یہ ہر کسی کو بتانی ہے اب
کہ ہر اک شے ہمیں خود بنانی ہے اب

جب خدا نے دیا ہم کو عقل و شعور
پھر بھی ہیں آج کیوں ہم ترقی سے دور

بس یہی چیز کر کے دکھانی ہے اب
کہ ہر اک شے ہمیں خود بنانی ہے اب

ہم کریں کم سے کم اپنی درآمدات
اور بڑھائیں بہت اپنی برآمدات

ایسے اپنی معیشت بچانی ہے اب
کہ ہر اک شے ہمیں خود بنانی ہے اب

جب بنائیں گے ہر چیز خود ہم یہیں
تب نہ جانا پڑے گا ہمیں پھر کہیں

بات اہلِ وطن کو سکھانی ہے اب
کہ ہر اک شے ہمیں خود بنانی ہے اب

اک یہی عزم ہے، بس مرا ارسلاںؔ
کہ ہو خوش حال اب یہ میرا گلستاں

کوئی کہہ نہ سکے کہ "گرانی ہے اب"
کہ ہر اک شے ہمیں خود بنانی ہے اب

اسلامی دستور

جناب زکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ

اسلام کی بنیاد پر یہ ملک بنا ہے اسلام ہی اس ملک کا سامانِ بقا ہے
بنیاد پر قائم نہ رہے گا تو فنا ہے دنیا کی نگاہوں سے نہیں بات یہ مستور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

اب رات کٹی ظلم کی، آئے گا سویرا پھیلے گی ضیا نور کی، بھاگے گا اندھیرا
ہو جائے گا ہر سمت اُجالوں کا بسیرا سرخی جو اُفق پر ہے وہ ہو جائے گی کافور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

قانونِ الٰہی نہ ٹلا ہے، نہ ٹلے گا ہر ازم کے خورشید کو ڈھلنا ہے، ڈھلے گا
اس ملک میں اسلام کا سکہ ہی چلے گا بن جائے گی یہ پاک زمیں جلوہ گہِ طور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

اچھائی کو پھیلائیں گے، روکیں گے برائی چلنے نہیں دی جائے گی بندوں کی خدائی
جتنے بھی مسلمان ہیں آپس میں ہیں بھائی اللہ کا یہ حکم ہے ہم لوگ ہیں مامور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

اسلام سکھاتا نہیں انساں کو دورنگی اس کے لیے یکساں ہیں وہ ابیض ہو کہ زنگی
تہذیب ہماری ہے نہ روسی نہ فرنگی بہتا ہوا یہ زخم، وہ رِستا ہوا ناسور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

اسلام کی تعلیم یہاں عام کریں گے سب کا ہو بھلا جس میں وہ ہی کام کریں گے
سب مل کے ترقی کے لیے کام کریں گے افسر ہو کہ تاجر ہو وہ آقا ہو کہ مزدور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

اسلاف کی ہم زندہ روایات کریں گے راضی ہو خدا جس سے وہی بات کریں گے
اس ملک میں قائم وہ مساوات کریں گے سب شاہ و گدا آئیں نظر خُرم و مسرور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

دولت کا یہاں کوئی پجاری نہ رہے گا انسان کا انسان شکاری نہ رہے گا
جاری ہے جو اب ظلم یہ جاری نہ رہے گا ظالم نظر آئے گا نہ مظلوم نہ مقہور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

آزاد تجارت کو نہ پابند کریں گے ہاں سود کے بازار کو ہم بند کریں گے
ہم عزت و توقیر ہنر مند کریں گے محنت جو کرے گا وہ صلہ پائے گا بھرپور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

دولت کو بکھیریں گے سمٹنے نہیں دیں گے ہاتھوں میں امیروں کے ہی بٹنے نہیں دیں گے
ہم جادۂ انصاف سے ہٹنے نہیں دیں گے ہو جائیں گے خوش حال جو بدحال ہیں مزدور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

اسلام محبت بھی ہے اخلاص و وفا بھی تسکین دل و جاں بھی ہے چہروں کی ضیا بھی
ہر درد کا درماں بھی ہے پیغام شفا بھی کردار ہی کردار ہے اسلام کا منشور
ہم لائیں گے اس ملک میں اسلام کا دستور

گلدستہ

ترتیب و پیشکش: شیخ ابو بکر، عبدالرحمن چترالی

حمدِ باری تعالیٰ

مالک ارض و سما کو یاد کرتا ہے جہاں
حمد گاتی ہے زمیں تسبیح پڑھتا آسماں
ہاتھ باندھے پیڑ سارے جنگلوں میں ہیں کھڑے
سب مویشی اس کی عظمت میں رکوع کرتے ہوئے
جانور سب رینگتے سجدے میں ہیں گویا پڑے
ذرہ ذرہ اس زمیں کا رب کا ہے تسبیح خواں
یاد کرتا ہے خدا کو ہر گھڑی سارا جہاں
یہ زمیں اللہ کی حمد و ثنا میں ہے مگن
اس کی پاکی کو بیاں کرتا ہوا نیلا گگن
عظمتِ رب کے قصیدہ خواں ہیں یہ کوہ و دمن
اک اسی کے نام سے روشن ہوئے کون و مکاں
یاد کرتا ہے خدا کو ہر گھڑی سارا جہاں
اس کی عظمت کے شواہد چار جانب ہیں عیاں
ہے ہر اک ذرّے کے دل میں مالکِ ملکِ جہاں
مالک ارض و سما کو یاد کرتا ہے جہاں
حمد گاتی ہے زمیں تسبیح پڑھتا آسماں

شاعر: محمد اسد اللہ

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

نبی کون یعنی رسولِ کریم ﷺ — نبوت کے دریا کا دُرِّ یتیم
ہوا گو کہ ظاہر میں اُمّی لقب — پہ علمِ لدنی کھلا دل پہ سب
بغیر از لکھے اور کہے بے رقم — چلے حکم پر اس کے لوح و قلم
کیا حق نے نبیوں کا سردار اسے — بنایا نبوت کا حق دار اسے
نبوت جو کی حق نے اس پر تمام — لکھا اشرف الناس خیر الانام
بنایا سمجھ بوجھ کر خوب اسے — خدا نے کیا اپنا محبوب اسے
کہوں اس کے رتبے کا کیا میں بیاں — کھڑے ہوں جہاں باندھ صف مرسلاں
محمد کے مانند جگ میں نہیں — ہوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں
یہ تھا رمز اس کے جو سایا نہ تھا — کہ رنگ دوئی واں تک آیا نہ تھا
نہ ہونے کا سائے کے تھا یہ سبب — ہوا صرف کعبہ کی پوشش میں سب
نہ ڈالی کسی شخص پر اپنی چھاؤں — کسی کا نہ منہ دیکھا دیکھا اس کے پاؤں
وہ ہوتا زمیں گیر کیا فرش پر — قدم اس کے سائے کا تھا عرش پر
جہاں تک کے تھے یاں کے اہلِ نظر — سمجھ مایۂ نور کحل البصر
سبھوں نے لیا تتلیوں سے اٹھا — زمیں پر نہ سائے کو گرنے دیا
سیاہی کی پتلی کا ہے یہ سبب — وہی سایہ پھرتا ہے آنکھوں میں اب
وگرنہ یہ تھی چشم اپنی کہاں — اسی سے تو روشن ہے سارا جہاں

شاعر: میر حسن

جسم ادھار مال ہے

یہ جسم ہمیں مستعار ملا ہے، ادھار کا مال ہے۔ یہ ہماری ملکیت نہیں ہے۔ یہ اس پیدا کرنے والے کی ملک ہے، مالک وہ ہے۔ ہمیں کچھ دیر استعمال کے لیے پروردگار نے عطا فرمادیا اور جو ادھار کے مال پر فریفتہ ہوتا پھرے، اس کو پاگل اور دیوانہ کہتے ہیں کہ ادھار کے مال پر فریفتہ ہوا پھر رہا ہے۔ ہم اس جسم کو نیکی کے کاموں میں جتنا استعمال کر سکتے ہیں، اتنا کر لیں۔ دستور یہی ہے اگر گھر میں استری خراب ہو جائے اور ہم بھائی کے گھر سے منگائیں کہ جی ہمیں دفتر جانا ہے تو بیوی ایک جوڑا استری نہیں کرتی، وہ اپنے بھی کر لیتی ہے، بچوں کے بھی کر لیتی ہے، دو چار دن کے کر لیتی ہے کہ اپنی استری آنے میں ٹائم لگ جائے گا تو ادھار لیا ہے، بار بار مانگی بھی نہیں جاتی، اب تھوڑی دیر میں جتنا کام نکال سکتے ہو نکال لو، جس طرح ادھار کی چیز پر تھوڑی دیر میں زیادہ سے زیادہ کام لوگ نکالتے ہیں، ہمیں بھی چاہیے یہ جسم ادھار کا مال ہے، تھوڑے وقت میں اس سے زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کر لو۔

(وقت ایک عظیم نعمت، مولانا روح اللہ، ص: 159)

بدلتے موسم

جس طرح موسم بدلنے کا ایک وقت ہوتا ہے، اسی طرح وقت کے بدلنے کا بھی ایک موسم ہوتا ہے۔ حالات بدلتے ہی رہتے ہیں۔ حالات کے ساتھ حالت بھی بدل جاتی ہے۔ رات آجائے تو نیند بھی کہیں سے آہی جاتی ہے۔ وہ انسان کامیاب ہوتا ہے، جس نے ابتلا کی تاریکیوں میں اُمید کا چراغ روشن رکھا۔ اُمید اس خوشی کا نام ہے، جس کے انتظار میں غم کے ایام کٹ جاتے ہیں۔ اُمید کسی واقعہ کا نام نہیں، یہ صرف مزاج کی ایک حالت ہے۔ فطرت کے مہربان ہونے پر یقین کا نام اُمید ہے۔

(کرن کرن سورج، واصف علی واصف، ص: 28)

اشعار

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

لال چند فلک

ہے جرم اگر ملک کی مٹی سے محبت
یہ جرم سدا میرے حسابوں میں رہے گا

انیلا

اے اہلِ وطن شام و سحر جاگتے رہنا
اغیار ہیں آمادۂ شر جاگتے رہنا

جعفر بلوچ آبادی

نہ پوچھو ہم سفرو! مجھ سے ماجرا وطن
وطن ہے مجھ پہ فدا اور میں فدائے وطن

مردان علی خان رانا

کارواں جن کا لٹا راہ میں آزادی کی
قوم کا ملک کا ان درد کے ماروں کو سلام

بانو طاہر سعید

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو اُنس باقی ہے
مزہ دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

چکبست برج نرائن

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

افتخار عارف

جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

علامہ اقبالؒ

لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے
اُچھل رہا ہے زمانے میں نامِ آزادی

فراق گورکھپوری

اے وطن جوش ہے پھر قوتِ ایمانی میں
خوف کیا دل کو سفینہ ہے جو طغیانی میں

جوش ملیح آبادی

دعا کے آداب

دعا کیا ہے؟ اپنی عاجزی اور بے چارگی کا اظہار، اللہ کی قدرت و طاقت کے سامنے اپنی ناطاقتی، پستی کا اظہار ہی عبادت کی اصل روح ہے۔ اس لیے دعا کو بھی عین عبادت قرار دیا گیا ہے اور اسی لیے یہ بھی صرف اللہ کا حق ہے، اس کے سوا کسی اور سے دعا کرنی جائز نہیں۔ دعا میں آداب وانکساری، خشوع و خضوع لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان آداب کو خود سکھاتا ہے کہ اُدعُوا رَبَّکُم تَضَرُّعًا (اپنے رب کو گڑگڑا کر پکارو) اور یہ سمجھو کہ میرا رب میری بات کو سنتا اور میری تمام حرکات و سکنات کو دیکھتا ہے۔ دعاؤں میں اپنے گناہوں کا اقرار اور اس بات سے توبہ کریں کہ آیندہ ہر گز ایسا کام نہیں کریں گے۔ شرط: (1) دعا میں ایمانِ کامل کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے، یعنی صرف اللہ ہی کا خیال دل و دماغ اور زبان پر ہو۔ (2) کھانا، پینا اور پہننا وغیرہ حلال و پاکیزہ کمائی کا ہو، اگر حرام کی آمزیش ہوئی تو دعا قبول نہیں ہوتی۔ (3) دعا کرنے والا حرام، جھوٹ، شراب نوشی، حسد و تکبر، غیبت و چغلی وغیرہ جیسے گناہ سے اجتناب کرے۔

(اصلاح المسلم، عبدالستار بن محمد عمر، ص: 247)

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا صبر

امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مخالف تھا۔ اس کو پتا چلا کہ آپ کے والد کی وفات ہو گئی۔ والدہ بوڑھی تھیں۔ نوّے سال کے قریب عمر ہو گئی۔ وہ ایک دن آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ شرع شریف میں حکم ہے کہ تم بیواؤں کا نکاح کر دو۔ تمہاری والدہ چوں کہ بیوہ ہو چکی ہیں، میں نے سنا ہے کہ بڑی خوب صورت ہیں، حسینہ و جمیلہ ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ میں ان کے ساتھ نکاح کروں۔ حضرت نے سنا تو بھانپ گئے، فرمانے لگے: بھئی! میری والدہ عاقلہ بالغہ ہیں اور اس عمر کی عورت کو شرعی طور پر اپنا فیصلہ خود کرنے کا اختیار ہوتا ہے، میں ان کے سامنے جا کر بات کر دیتا ہوں۔ اس نے کہا: بہت اچھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گھر کی طرف جانے کے لیے دو قدم اٹھائے تو کیا دیکھا کہ اس آدمی کے پیٹ کے اندر کوئی درد اُٹھا۔ اس درد کے اندر وہ بندہ گرا اور وہیں پر اس کی موت آ گئی۔ امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ابو حنیفہ کے صبر نے ایک بندے کی جان لے لی۔

(سکونِ قلب، مولانا اشرف علی تھانوی، ص: 147)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور آخرت کا دھیان

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں اور بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے استاد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جمعہ کے دن کسی بازار میں چلا گیا، ان کو کوئی چیز خریدنی تھی، چناں چہ بازار جا کر وہ چیز خرید لی، جب بازار سے واپس لوٹنے لگے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے فرمایا: اے سعید! میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمہیں دونوں کو جنّت کے بازار میں جمع کر دے۔ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان دیکھیے کہ وہ ہر آن اور ہر لمحے آخرت کی کوئی نہ کوئی بات ادنیٰ سی مناسبت سے نکال کر اس کے دھیان کو اور اس کے ذکر کو تازہ کرتے رہتے تھے، تاکہ دنیا کی مشغولیات انسان کو اس طرح اپنے اندر مشغول نہ کر دیں کہ انسان آخرت کو بھول جائے۔ لہٰذا دنیا کا کام کر رہے ہیں، بازار میں خریداری کر رہے ہیں اور خریداری کے دوران شاگرد کے سامنے یہ دعا کر دی۔

(اصلاحی خطبات، مفتی محمد تقی عثمانی، ج: 9، ص: 238)

جامعہ بیت السلام کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے

ڈیجیٹل لائبریری

رپورٹ: فصیح الدین

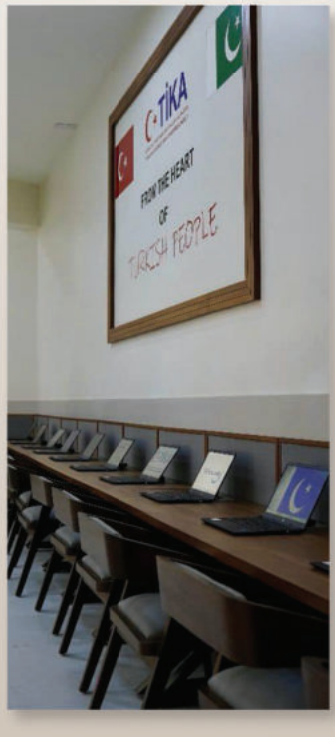

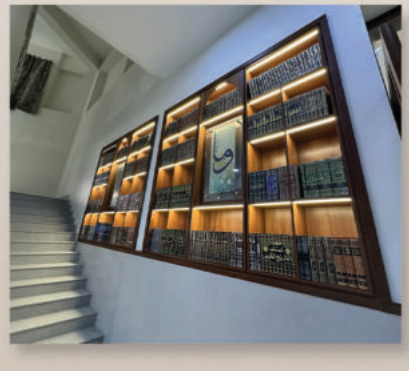

یوں تو ہر لکھنے پڑھنے والا باذوق شخص کسی نہ کسی درجے میں کتابوں سے استفادے اور مطالعے کا اہتمام کرتا ہے لیکن اساتذہ وطلبہ کا تو کتاب کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان کی رگ رگ اور ریشے میں کتاب کی محبت رچی بسی ہوتی ہے۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں شخصی کتب خانوں کے ساتھ ساتھ ادارہ جاتی اور پبلک لائبریریاں قائم کی جاتی ہیں۔ پھر خاص طور پر تعلیمی اداروں میں یہ اہتمام زیادہ وسعت کے ساتھ ہوتا ہے ادارے ہر سال کتب میں اضافے کا بجٹ رکھتے ہیں اور مختلف موضوعات پر شائع ہونے والی نئی کتابیں اپنی لائبریری کا حصہ بناتے ہیں۔ جامعہ بیت السلام بھی اپنے اساتذہ اور طلبہ کی علمی پیاس بجھانے کے لیے لائبریری کو وسیع سے وسیع تر کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

ڈیجیٹل دور میں کتب سے استفادے کے لیے تعلیمی اداروں میں بالخصوص ڈیجیٹل لائبریریاں بھی قائم کی جاتی ہیں جامعہ بیت السلام اپنے ہم خیال ترک رفاہی ادارے ٹیکا کے اشتراک سے ڈیجیٹل لائبریری کا قیام عمل میں لایا ہے۔

24 میں سے 18 گھنٹے اساتذہ وطلبہ اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ ڈیجیٹل لائبریری کا یہ نظم وقت کے ساتھ ساتھ مزید وسیع اور نئے ورژن کے مطابق ترقی پائے گا ان شاء اللہ

بیت السلام ٹیک پارک

BAITUSSALAM
—TECH PARK—

Free of Cost

PSDC Professional Software Development Certification

JS TS React node JS

Follow us
BaitussalamWelfareTrust

UAN
+92 21 111 298 111

Visit
Baitussalam.org

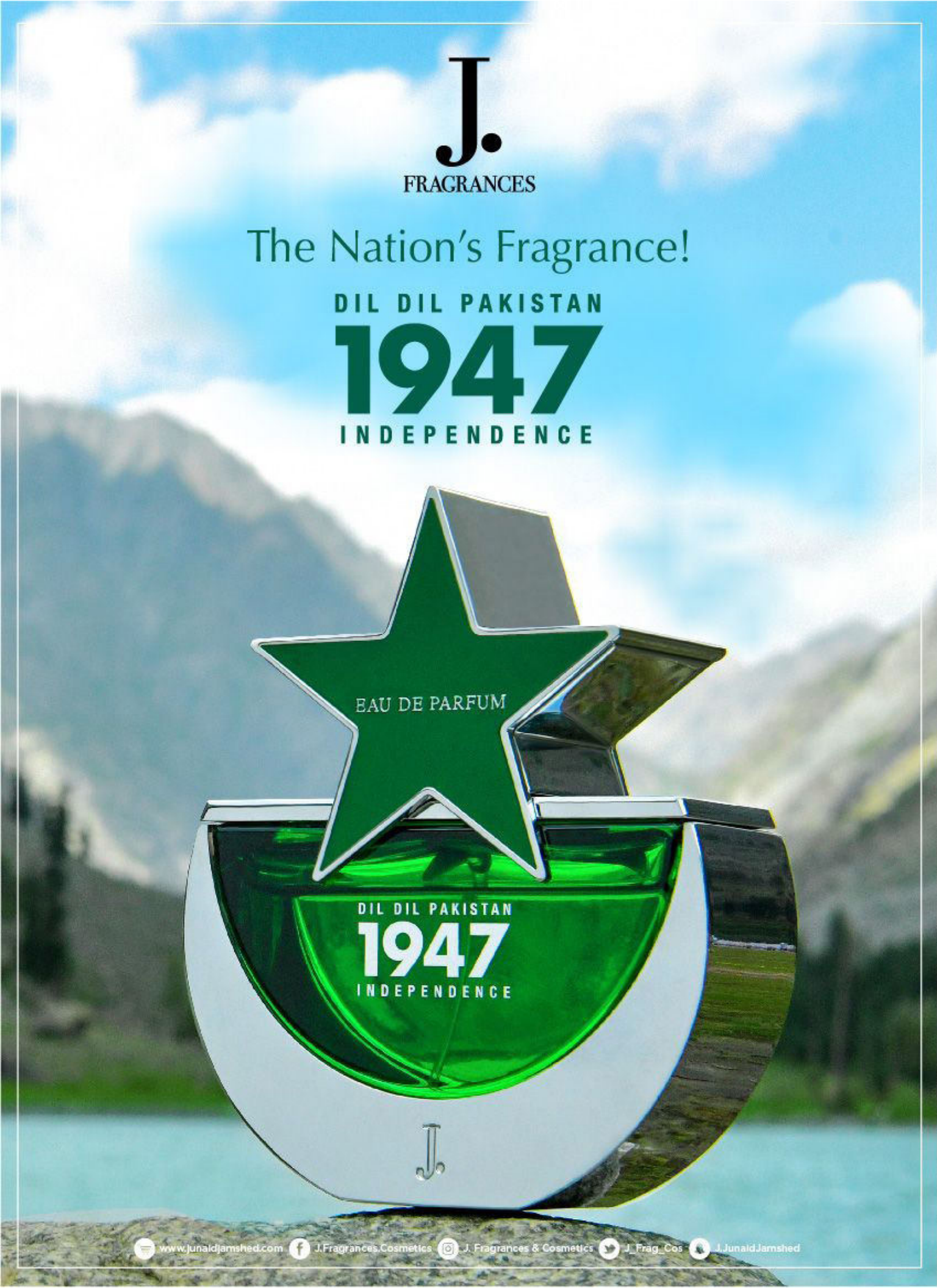
J.
FRAGRANCES
The Nation's Fragrance!
DIL DIL PAKISTAN
1947
INDEPENDENCE
EAU DE PARFUM
DIL DIL PAKISTAN
1947
INDEPENDENCE
www.junaidjamshed.com
J.Fragrances.Cosmetics
J. Fragrances & Cosmetics
J_Frag_Cos
J.Junaid.Jamshed